انتساب

"ایوان اشاعت" اپنی اس کتاب کو صدق نیت اور خلوص جذبات کے ساتھ جناب سید ضامن علی صاحب رئیس گورکھپور کے نام پر معنون کرتا ہے جن کو اس کے ساتھ سچی ہمدردی ہے اور جنکی اعانت کو اس کا سنگ بنیاد کہنا چاہئے۔

سکریٹری
ایوان اشاعت
گورکھپور

عنوانات

تمہید

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جناب ماسٹر شرف الدین بی، اے، بی، ٹی نے جو مدد دی ہے "ایوان اشاعت" اُس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

انھوں نے ہندوستان کی مشہور اور مستند تاریخوں اور متعدد درسی کتابوں سے مواد فراہم کر کے "ایوان اشاعت" کو دئے۔ جنکو حذف و اضافہ اور ترمیم و تصحیح کے بعد اس صورت میں شایع کیا جارہا ہے۔ اُمید ہے طلبہ اور خواتین اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھیں گی اور اس سے کماحقہٗ بہرہ اندوز ہونگی

سکریٹری
ایوان اشاعت
گورکھپور

ہندوستان
کی
بہادر عورتیں
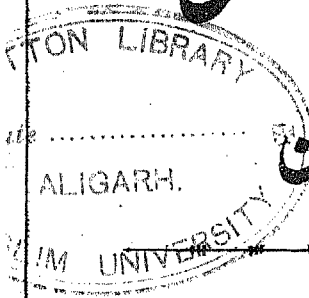
(۱)
رانی دُرگاوتی

دکن کے پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹی سی ریاست گونڈوانہ تھی جسکی راجدھانی گڈھ تھی۔ زیادہ تر اُس میں راجپوتوں کی جفاکش اور بہادر قوم آباد تھی۔ راجہ دالپت سنگھ اُن کا سردار تھا۔ وہ بہادری میں یکتا تھا۔ رعایا بھی اُس کو بہت مانتی تھی اُس کی رانی دُرگاوتی ایک مشہور راجپوت راجہ کی بیٹی تھی۔

گونڈوانہ ایک خود مختار ریاست تھی جس نے آج تک کبھی کسی کا لوہا نہ مانا تھا۔ راجہ بھی منوجی کے قدم بقدم چلتا تھا۔ وہ دور اندیشی و انصاف کا پُتلا تھا۔ رعایا آسودہ اور خوشحال تھی۔ لوگ مختلف پیشوں پر بسر اوقات کرتے تھے۔ مُلک میں کوئی فتنہ تھا نہ کوئی فساد۔ ہر طرح امن و امان تھا چین اور سکھ کی نیند سوتے اور اپنا کام آزادی کے ساتھ انجام دیتے۔ فلک کج رفتار سے یہ چین اور سُکھ دیکھا نہ گیا۔ راجہ دالپت سنگھ کو عین شباب میں موت کے ظالم ہاتھوں نے رعایا سے جُدا کر دیا۔ بیچاری دُرگاوتی بیوہ ہو گئی۔ اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا جس کا نام ویر نارائن تھا۔ محض مُلک اور بچہ کی خاطر دُرگاوتی کو ستی کے خیال سے باز رہنا پڑا۔ وہ مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ راج پاٹ کا کام دیکھنے لگی۔ لوگ راجہ دالپت سنگھ کے زمانہ کو بھول گئے، اور رانی دُرگاوتی کے گیت گانے لگے۔

سولھویں صدی آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دہلی کے تخت پر اکبر اعظم رونق افروز تھا۔ ہندوستان میں چاروں طرف فتح کا نعرہ بلند تھا۔ مقبوضات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اکبر کی نظر گونڈوانہ پر بھی پڑی جس کی مالک ایک عورت تھی۔ اکبر کا سپہ سالار آصف خاں کچھ کم حوصلہ والا نہ تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ گونڈوانہ کو زیر کر کے رہے گا۔

مغلوں کے حملہ کی خبر اہل گونڈوانہ کے کانوں میں پڑی۔ خبر کاہے کو تھی ایک آگ تھی جو پل مارتے ملک کے چپہ چپہ میں پھیل گئی۔ لوگوں کو کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہونگے۔ وہ نہ تو کسی پڑوسی سلطنت سے لڑتے بھڑتے تھے اور نہ خونریزی کو اچھا سمجھتے تھے۔ امن کی زندگی تھی۔ کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مغلوں کے حملہ کی خبر نے سب کو سراسیمہ کر دیا۔ حیران تھے کہ ہم مٹھی بھر راجپوت مغلوں کی بے شمار فوج کا کیونکر مقابلہ کرینگے۔ وہ ناامید و دل شکستہ

تو ہو رہے تھے مگر ہمت اور قومی جوش میں کمی نہ تھی۔

اُنھوں نے عہد کر لیا کہ مُلک کی بھینٹ چڑھ جانا ذلت اور غلامی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ رانی دُرگا وتی نے دل بڑھائے اور کہا "بہادرو! جب تک اچھوتی خون رگوں میں لہریں لے رہا ہے گردن جھکانا تو درکنار اسکا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ تم بھی مر مٹو مگر خونخوار مُغلوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالو۔" انجام جو کچھ بھی ہو دُرگا وتی نے مقابلہ کی ٹھان لی تھی، اور اپنے سورماؤں کی ثابت قدمی اور جوانمردی سے مطمئن تھی جیوں ہی مسلح ہو جانے کا حکم رعایا کو ملا وہ جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مُلک کے نوجوان اکڑتے اور سر کو ہتھیلی پر لئے کر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد فوج تیار ہو گئی۔ عورتیں اور بچے بھی اس مہم میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ دوش بدوش میدان جنگ میں لڑنے کے لئے آمادہ تھے۔ دُرگا وتی سپہ سالار بنی اور میدان میں مغلوں کا انتظار

کرنے لگی۔ اُن لوگوں کے دلوں میں یہ بات سما چکی تھی کہ ظالم مُغلوں کے حملہ کو ہم ضرور روک لیں گے اور اپنے ملک اور اپنی آزادی پر حرف نہ آنے دیں گے۔ ہر شخص اپنی بہادری کا جوہر دکھانے کے لئے بے چین تھا۔

آصف خاں مُغلوں کا سپہ سالار تھا۔ وہ اس خیال میں تھا کہ بھلا عورت ذات اُسکے سامنے کیا ٹھہریگی۔ چھوٹی سی سلطنت ہے بلا کارزار کے ہاتھ آجائیگی۔ جب مقابلہ کی ٹھہری تو مُغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بہادر راجپوت مقابلہ کے لئے شمشیر تول رہے تھے۔ اپنے زعم میں **آصف خاں** فوج بھی زیادہ نہ لایا تھا۔ ایک مختصر سا رسالہ تھا جو آب آنکھ کھلنے پر محض ناکافی نظر آنے لگا۔

آخر دہلی سے فوج طلب کی گئی۔ آصف خاں نے اس اثنا میں ایک شخص کو کچھ پیغام دیکر رانی کے پاس بھیجا۔ پیغام یہ

سامنے بلایا گیا تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”غیرت دار اور شریف رانی! میں آصف خاں کی طرف سے آیا ہوں، وہ اکبر اعظم کی فوج کا سپہ سالار ہے۔ یہ پیام گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مُغل نہ تو لڑنے کے لئے تیار ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیّت سے آئے ہیں۔ ہاں اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو شہنشاہ کے سپرد کر دیجئے اور اُسے اپنا مہاراج تسلیم کر لیجئے پھر ساری فوج واپس چلی جائیگی اور آپ کا راج پاٹ برقرار رہے گا“۔

قبل اس کے کہ پیامبر اپنا آخری جملہ تمام کرے درگاوتی غصّہ میں کانپتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور کڑک کر بولی ”اپنے سردار سے کہہ دو یہ خیال بھی دل میں نہ لائے کہ ہم راجپوت مُغلوں کی فوج کو دیکھ کر ڈر جائینگے۔ سامنے میدان جنگ ہے اب یہیں فیصلہ ہو گا کہ ہم اکبر کو شہنشاہ تسلیم کریں گے یا آزاد رہیں گے“۔ یہ کہکر پیامبر کو دربار سے رخصت کر دیا۔

آصف خاں کو یہ جواب سُنکر حیرت ہوئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ رانی اپنی مختصر فوج لیکر مُغلوں کے لشکر عظیم کا مُقابلہ کرنے پر تُل جائیگی۔ دہلی سے فوج آگئی تھی۔ مُغلوں نے گڑھ کی طرف قدم بڑھائے۔ راجپوت بھی آگے بڑھے۔ مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں طرف تلواریں چلنے لگیں۔ رانی کے جسم پر لوہے کی زرہ چمک رہی تھی۔ سر پر خود تھی جسکی جھلک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ تلوار ہاتھ میں تھی اور ایک سفید گھوڑے پر سوار تھی۔ آصف خاں رانی کو دیکھکر دنگ رہ گیا۔ اُسکے ہر وار پر اسکی زبان سے بے ساختہ "واہ" نکل جاتی تھی۔ سوار اور پیدل دونوں لڑائی میں گُتھ گئے۔ رانی بھی تلوار سُوت کر کود پڑی۔ آناً فاناً نہ جانے کتنے مُغلوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اُسے دیکھ کر راجپوتوں کا دِل بڑھتا رہتا، مگر مُغل کانپ کانپ اُٹھتے تھے۔ وہ رہ رہ کر نعرہ لگا رہی تھی۔ "میرے بہادر سپاہیو! بڑھو! بڑھو! اپنی عزت، اپنے مُلک کے لئے تلوار

چلاؤ!" پیدل اور سوار دونوں کامیاب ہوے۔ کوئی حملہ کو روکتا تو کوئی تلوار چلاتا۔ جلد ہی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ مُغلوں کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان راجپوتوں کے ہاتھ رہا۔ دُرگاوتی نے زرہ اور خود اُتار کر دُرگا دیوی کے آگے سجدۂ شکر ادا کیا اور اپنے محل میں چلی گئی۔

آصف خاں کی غیرت کیسے گوارا کرتی کہ عورت سے ہار کر چین سے بیٹھ رہتا۔ یہ شکست اسکے لئے ڈوب مرنے کی بات تھی۔ اس سے بڑھکر اُسکی رُسوائی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک عورت نے اُسکو نیچا دکھایا۔ وہ سوچتا تھا اور مارے غیرت اور غُصّہ کے بُھنا جاتا تھا۔ اُس نے پھر ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کیا اور دُرگاوتی کے شہر پر چڑھائی کی۔ رانی بھی غافل نہ تھی۔ پہلے ہی سے یہ ڈر لگا ہوا تھا۔ اُس نے بھی اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور دشمن کے مقابلہ پر آ گئی۔ اِس مرتبہ لڑائی اور بھی زیادہ گھمسان رہی۔ تمام دن کُشت و خون ہوتا رہا

دونوں طرف مارنے اور مرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مگر راجپوتوں کی سرفروشی اور دُرگا وتی کی ہمّت نے مُغلوں کے قدم ہلا دئیے۔ وہ جس طرح آئے تھے اُسی طرح پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آصف خاں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا، اُس کا دل ڈوبا جا رہا تھا مگر دُرگا وتی کے بھی بُرے دن آرہے تھے۔ جو کام تلوار سے نہ ہوا وہ مکر اور فریب کے ذریعہ انجام پا گیا۔ مُغلوں کو دوسری مرتبہ شکست دینے کے بعد راجپوت فتح کی خوشیاں منا رہے تھے، شہر میں چراغاں ہو رہا تھا۔ دُرگا وتی نے دِل کھول کر انعام تقسیم کیا۔ لیکن نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جبکہ اُس نے اپنے لڑکے ویر نارائن کو فوج کا افسر بنا دیا۔ بس کیا تھا۔ کچھ راجپوت بدظن ہو گئے۔ اُن کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ کہنے لگے کہ رانی نے خود غرضی سے کام لیا ہے۔ اب وہ اگلے سے وفادار اور جاں نثار راجپوت نہ تھے۔ حسد اور غصّہ نے اُنکی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ اُنھوں نے

مُغلوں کو خُفیہ خطوط بھیجے کہ دُرگاوتی کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے، آؤ اور مُلک پر حملہ کرو۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔

آصف خاں تو خُد اسے چاہتا تھا کہ کسی طرح کلنک کا ٹیکا اپنی پیشانی سے دور کرے فوج لیکر قلعہ پر چڑھ آیا، اور اپنی **دُرگاوتی** کے اقبال نے اُسکا ساتھ نہیں دیا۔

نگہبان نے خطرہ سے جیوں ہی رانی کو آگاہ کیا، اُس نے زرہ اور خُود پہنی اور میدان جنگ میں آکھڑی ہوگئی۔ فوج دو حصوں تقسیم کی گئی۔ ایک دستہ کی سپہ سالاری اپنے بیٹے کے سپرد کی اور دوسرے کو خود اپنی سرکردگی میں رکھا۔ مگر حسد اور غدّاری کا بُرا ہو۔ لڑائی کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا گیا۔ آخر کار جاں باز راجپوتوں میں اتنا دم نہ رہا کہ مُغلوں سے جم کر لڑتے۔ اُنھوں نے دُرگاوتی کو سمجھایا کہ اب مقابلہ بے کار ہے۔ ہتھیار ڈال دینا ہی بہتر ہوگا۔ مگر رانی نے ایک نہ سُنی۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ جھپٹ کر

وار کر رہی تھی اور اپنے چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگا رہی تھی۔ اسی میں ولی عہد کو ایک ایسا زخم کاری لگا کہ وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ ماں کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ غم اور غصّہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ بیچ لشکر میں گھس گئی۔ اب جو سامنے آتا تھا وہ تلوار کی نذر ہو جاتا تھا۔ مغلوں کے قدم اُکھڑنے والے ہی تھے کہ دشمن کا ایک تیر آ کر اُسکی آنکھ میں بیٹھ گیا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ تیر نکال کر پھینک دے، مگر ایک سپاہی نے لپک کر بھالا اُسکے سینے کے پار کر دیا۔ رانی درگاوتی سنبھل نہ سکی۔ گونڈوانہ کی بہادر رانی زمین پر آ رہی۔ درگاوتی نے ملک اور قوم کے لئے اپنے کو قربان کر دیا اور تاریخ کے صفحوں میں اپنی جاں نثاری کی داستان چھوڑ گئی۔ اُس کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔

(۲)

چاند بی بی

چاند بی بی سلطانہ نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی تھی وہ ۱۵۴۸ء میں پیدا ہوئی۔ ابھی بالکل کمسن تھی کہ اسکی تربیت شروع ہو گئی اور اچھے برے کی تعلیم دی جانے لگی۔ پاک باطنی اور سچائی کا سبق اسکے دل میں نقش کر دیا گیا۔ چاند بی بی اپنی پیدائش کے بعد ہی ماں کی آغوش سے محروم ہو چکی تھی۔ سلطان نے اسکی پرورش کی۔ اپنی چہیتی بیوی کی یاد اسی لڑکی سے تازہ کر لیا کرتا۔ چاند سلطانہ مرحومہ ماں کی زندہ شبیہ تھی۔ سلطان کی اس سے بہت کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ بیٹی ہر وقت باپ ہی کی صحبت میں رہتی۔ اور فی الحقیقت باپ ہی کی گود میں چاند سلطانہ نے حکومت کرنا سیکھا۔ چاند سلطانہ نے صورت بھی

بڑی دلکش پائی تھی۔ اُسکی معصوم اور خوبصورت آنکھیں، اُسکا مہتابی رنگ، اُسکا پیارا قد، بس یہی چاہتا تھا کہ دیکھتے رہو۔ سیکڑوں شہزادوں نے شادی کے پیغام بھیجے، مگر مُلک کی مصلحتوں کو مدِّنظر رکھ کر نظام شاہ نے علی عادل شاہ کو چُنا۔ اور چاند سُلطانہ کی شادی اُسکے ساتھ قرار پاگئی۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ رشتہ دو سلطنتوں کو ایک کردے گا۔ پھر اتفاق و یکجہتی کے ساتھ مُغلوں کی روک تھام ہوگی۔

علی عادل شاہ بیوی کو بے حد چاہتا تھا۔ اُسکی کسی خواہش کو رد نہ کرتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار پر چاند سُلطانہ کی ذہانت و فہم اور اُسکی دور اندیشی کا بڑا اثر پڑا۔ اس سے پہلے اُمراء اپنا سارا وقت جنگ و جدل میں ضایع کرتے۔ اب اُن میں صلح اور محبت کا مادہ پیدا ہوگیا۔ جو دولت قمار بازی اور سیر و شکار میں اُڑتی تھی وہ رعایا کی بہبود کے لئے صرف ہونے لگی۔ مسجدیں

جو ویران ہوگئی تھیں نمازیوں سے پھر آباد ہوگئیں۔ غریبوں اور یتیموں میں خیرات تقسیم ہونے لگی۔ عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ لیکن کسی کے دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔ زمانہ کی گردش کا کوئی اعتبار نہیں بیجاپور کی بربادی کے دن بھی آگئے۔ موت کے بے رحم پنجوں نے بیجاپور والوں سے انکے والی علی عادل شاہ کو چھین لیا۔ ۱۵۸۰ء میں چاند سلطانہ کا سہاگ لٹ گیا۔ گود میں کوئی بچہ بھی نہ تھا جس سے اسکے دل کو ڈھارس ہوتی۔ اُمراء کی دست درازیوں کا کوئی روکنے والا نہ رہا تو انھوں نے بھی خانہ جنگی شروع کر دی۔

چاند سلطانہ نے کچھ عرصہ تک حتی المقدور بغاوت کو روکا۔ مگر کہاں تک؟ عورت ذات تھی کچھ بس نہ چلا۔ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرحوم سلطان کے کم سن بھتیجے ابراہیم کو

گو بھی لے لیا اور اُسکی طرف سے سارا انتظام کرنے لگی۔ مگر ہوا
ناموافق تھی۔ کامیابی مطلق نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں گولکنڈہ
بیدر۔ اور دوسری قرب جوار کی ریاستوں نے سر اُٹھایا۔
بیجاپور کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھانے کے خیال سے چاند
سُلطانہ پر چاروں طرف سے دھاوے ہونے لگے۔ رعایا میں امن
اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے چاند سُلطانہ نے ایک پُرجوش تقریر
کی اور اہل بیجاپور کی غیرت، حمیت اور وطن پرستی کے جذبات
کو کچھ ایسا اُبھارا کہ لوگ آپس کی پھوٹ کو بالائے طاق رکھکر دشمن
کے مقابلہ پر تُل گئے۔ اُس نے اُن کو نفاق کے بُرے نتیجے سمجھائے
اور کہا کہ "دشمن دروازہ پر کھڑا ہے۔ تم خواب غفلت سے بیدار
نہ ہوئے تو بیجاپور دوسری سلطنتوں کے زیر نگیں ہو جائیگا۔
رہی سہی وہ آزادی جو تمھیں زندگی سے زیادہ عزیز ہے دشمنوں
کے ہاتھوں میں چلی جائیگی۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ اُٹھو اور

آزادی کے لئے مر مٹو"

چاند بی بی کی تقریر رائگاں نہ گئی۔ اُس میں بلا کا جادو تھا، سب اپنے آپس کے جھگڑے بھول گئے۔ اور چاند بی بی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، سب نے ایک ہو کر زور لگایا اور دشمن کو نیچا دکھا دیا۔ دُنیا پر ثابت ہو گیا کہ "اتفاق سب سے بڑی قوت ہے"۔ تھوڑے ہی دنوں بعد قسمت نے پھر پلٹا کھایا۔ آپس کے جھگڑے پھر چھڑ گئے، مُلک میں ابتری پھیل گئی۔ اُسی زمانے میں نوجوان ابراہیم نے بھی جو سنِ شعور کو پہونچ چکا تھا پیٹ سے پاؤں نکالے۔ وہ لوگوں کے زہریلے مشوروں کا شکار ہو گیا۔ اور چاند بی بی کے خلاف سر اُٹھایا۔ خون کے آنسو روتی ہوئی چاند بی بی نے احمد نگر کی راہ لی۔ احمد نگر اسکی جائے ولادت تھی۔ مگر وہاں بھی چین کا ٹھکانا نہ ملا۔

بدقسمتی نے چاند بی بی کا ساتھ احمد نگر میں بھی نہ چھوڑا۔

جس اطمینان اور بے فکری کی تلاش میں وہ احمد نگر گئی تھی وہ
وہاں بھی مفقود تھی۔ خانہ جنگی کا دور دورہ وہاں بھی تھا۔
حسین شاہ کا جانشین اسکا بیٹا مرتضےٰ ہوا وہ بھی تلوار
کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا
دوسرا تخت نشین برہان نے ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو
سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مگر وہ بھی چند ہی روز
کی کامیاب حکومت کے بعد موت کے مُنہ کا نوالہ ہو گیا حسین
کے دوسرے لڑکے کی قسمت کا فیصلہ بھی یوں ہی ہوا۔
اب اسکا شیر خوار بچہ ابراہیم تخت و تاج کا حقدار قرار پایا۔
لیکن اسکا بھی وہی حشر ہوا۔ چاند بی بی سے ملک کی
ابتری دیکھی نہ گئی جھٹ شاہی خاندان سے ایک نہال کو
تخت نشین کر دیا۔ اور خود سلطنت کے کاروبار کی دیکھ بھال شروع
کر دی۔ اس نے اس ہات اور مستعدی سے اُلجھے ہوئے معاملات

سلجھا یا کہ لوگ لوہا مان گئے سلطنت کا کام اس خوش اسلوبی
سے انجام دیا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک میں
امن و صلح کا ڈنکا بجنے لگا۔ لوگ چین کی نیند سونے لگے۔
ہر طرح کی شورش دب گئی۔ مگر بعض اُمرا تھے جو چاند بی بی سے
جلتے تھے۔ اُنکے دل صاف نہ تھے۔ وہی چاند بی بی کے حُسنِ
انتظام میں رخنے ڈال رہے تھے، اُنکی تعداد زبردست تھی۔
چاند بی بی کے روکے کب رُک سکتے تھے۔ اُنھوں نے غدّاری کی
مُغل شہنشاہ اکبر کو خفیہ خطوط بھیجے۔ اور احمد نگر پر چڑھائی
کرنے کی دعوت دی۔

اکبر تو اس تاک میں بیٹھا ہی تھا کہ موقع ملے اور سلطنت کو
دکن کی طرف بڑھائے خط کا پانا تھا کہ حملہ کی تیاری شروع کر دی
شہزادہ مُراد ٹڈی دل فوج لیکر احمد نگر پر ٹوٹ پڑا۔
چاند بی بی بھی شجاعت میں کم نہ تھی۔ صورت تو عورت کی

ضرور تھی۔ مگر دل و دماغ میں کسی مرد سے کم نہ تھی۔ مقابلہ میں بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ایک طرف وہ اگر صلح پسند حکمراں تھی تو دوسری طرف بہادر اور جنگجو سپاہی بھی تھی۔ پہلے تو اُسنے نمک حرام دغابازوں کا کام تمام کیا۔ پھر حملہ روکنے کی تدبیریں کرنے لگی۔ اُس نے دل شکستہ درباریوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "آزادی پر فدا ہو جانے والو! اُٹھو۔ آپس کے نفاق کو بالائے طاق رکھدو۔ مُلک کی حفاظت تمھارا فرض ہے۔ تیار ہو جاؤ! دشمن تمھیں دھمکیاں دے رہا ہے۔ ایسا نہ ہو اُنکے سامنے تم ذلیل وحقیر ثابت ہو۔" مختصر سی تقریر میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ سب کے ہاتھ شمشیر کے قبضہ پر جا پڑے۔ سب نے قسم کھائی کہ مر کر بھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں گے۔ چاند سلطانہ نے والی بیجاپور سے مدد کی درخواست کی اور کمک مانگی۔ قلعہ کے اندر سامان رسد کافی جمع کر لیا۔ اور پھر شاہزادہ مراد کو پیغام بھیجا۔ "اگر دوستانہ تعلقات

قائم رکھنا منظور ہے تو تم کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار ہوں لیکن
اگر لڑائی مقصود ہے تو اس سے ہم لوگ مُنہ نہ موڑیں گے - مارنے
اور مرنے پر تُلے ہوئے ہیں - جبتک جسم میں خون کا ایک قطرہ
ہے سر نیچا نہ ہوگا " مُراد ایسی دھمکیوں کو کب خاطر میں لانے والا
تھا اُسکو تو شہنشاہ اکبر کی خوشنودی مدِ نظر تھی ، احمد نگر پر قبضہ
کرنا اصل مقصد تھا - مع اپنے لشکر عظیم کے احمد نگر کا محاصرہ کرلیا -

چاند بی بی نے ایسی صورت میں کیا کیا ہوگا ؟ عورت
تو تھی ہی قلعہ بند کرکے بیٹھ رہی ہوگی ؟ مگر نہیں ! اُسنے ایسا
نہیں کیا - اُس نے ہتھیار باندھے - خود ناکے ناکے کا مُعائنہ
کیا - اور جو لوگ اُنکی محافظت پر تعینات تھے اُن کو مشورے
دے کر میدان جنگ میں آئی - جہاں دیکھتی کہ گھمسان لڑائی
ہو رہی ہے وہیں چاند بی بی آدمیوں کا دل بڑھانے کیلئے
آموجود ہوتی - آدمیوں کا دل بڑھ جاتا اور وہ جوش میں اٹھ

ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ قلعہ کی دیواروں میں اِدھر شگاف ہوتا اُدھر اسکی مرمت ہوتی۔ احمد نگر کے عرب تیر انداز اپنے فن میں کامل تھے مغلوں کے دانت کھٹے کر دئے۔

شہزادہ مراد اس زعم میں تھا کہ عورت ذات بھلا کیا مقابلہ کریگی۔ مگر چاند بی بی کی بہادری اور سپہگری نے اُسکے حواس ٹھکانے کر دئے۔ چاند بی بی نے بڑے بڑے سپاہیوں کے کان کاٹ لئے۔ اب چاند بی بی کے سپاہیوں کو بھوک اور پیاس ستانے لگی۔ بہت سے تو مارے جا چکے تھے، اور مغلوں کو کامیابی کی اُمید نظر آنے لگی تھی۔ دیوار میں بھی سوراخ ہو گیا تھا۔ چاند بی بی عین اُس موقع پر آ پہونچی جب سپاہی دل شکستہ ہو کر میدان چھوڑنے کا قصد کر رہے تھے۔ اُسے خطروں اور دقتوں کا احساس ضرور تھا۔ مگر اُس نے جراُت کر کے سپاہیوں کو للکارا "بہادرو! میرے ملکی بھائیو! خوب دل کھول کر لڑے۔ شاباش! مگر کیا اسقدر

خوں ریزی اور سرفروشی کے بعد تم دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال دوگے؟ تقدیر کو پلٹا کھاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ زمانہ کا رنگ ایک ایک پل بدلتا رہتا ہے۔ آج سامنے ہم کو شکست کی منحوس صورت دکھائی دے رہی ہے۔ کل کامیابی ہماری گود میں ہو گی۔ ذرا عادل شاہی اور نظام شاہی زمانوں کو تو یاد کرو۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل گئے مگر آج تک گردن نہیں جھکی۔ وہ بھی کوئی انسان ہے جس کو اپنے وطن اور ہم وطنوں سے محبت نہ ہو۔ آزادی اور ناموس کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو مر جانا بہتر ہے۔ تم میں کون ایسا بزدل اور بے غیرت ہے جو دشمنوں کی غلامی قبول کرے گا؟ خیر تمہارا جواب جو کچھ بھی ہو میرا جواب سن لو۔ میں ہوں تو عورت مگر کیا مجال مغل مجھے اپنا غلام بنا لیں۔ تم سب میرا ساتھ چھوڑ دو۔ میں تنہا مقابلہ کروں گی۔"

یہ کہتے ہوئے چاند بی بی قلب لشکر میں گھس پڑی، اور

ہیبت ناک "کالی" کی طرح تلوار ہاتھ میں لیکر سر قلم کرنے لگی۔ دشمنوں کا صفایا یوں ہونے لگا جس طرح کسان ہری بھری کھیتی کو کاٹتے ہیں۔ چاند بی بی کی تقریر سے متاثر ہو کر اسکے سپاہی پل پڑے اور ایسا جم کر لڑے کہ مغلوں کے چھکے پانی کر دئے۔

مراد پہلے سے چاند بی بی کی دلیری کا اندازہ نہ کر سکا تھا۔ اب اُس پر اس عورت کا رعب چھا گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ "جبتک چاند سلطانہ سپاہیوں کے ساتھ ہے احمد نگر کا فتح کر لینا دشوار ہے۔" احمد نگر محفوظ رہا۔ مراد نے صلاح مشورہ کر کے چاند بی بی سے صلح کی درخواست کی۔ چاند بی بی مراد کے سپاہیوں کی کمزوری کو سمجھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً صلح منظور کر لی۔

لہ۔ کالی ایک راکشش ہے جو فتنہ و فساد برپا کرتا رہتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد غداروں نے پھر ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ پھر اکبر کو خطوط بھیجے جانے لگے۔ اس مرتبہ چند نمک حرام درباریوں نے اکبر کو میدان جنگ میں خود آنے کی ترغیب دی۔ وہ آیا۔ اور چاند بی بی کی سرکردگی میں احمد نگر نے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ اور خوب کیا۔ ہمت اور مردانگی دیکھو کہ چاند بی بی دست بدست لڑ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بارود اور گولیاں ختم ہو گئیں تو اس نے بندوقوں میں چاندی سونے کے زیورات اور سکے بھرنا شروع کئے۔ اکبر غور سے کارزار کا رنگ دیکھتا رہا۔ چاند بی بی کی شجاعت دل میں گھر کر چکی تھی۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ "لڑائی بند کی جائے ایسی بہادر عورت کی دوستی باعث فخر ہے۔" اُس نے فوراً چاند سلطانہ کو سلامی دی۔ اور صلح کی خواہش ظاہر کی۔ چاند سلطانہ خود بھی تھک چکی تھی، چاہتی تھی کہ کشت و خون کی

بازار اب بند ہو۔ اُس سے اپنے آدمیوں کا لڑ لڑ کر مرنا دیکھا
نہ جاتا تھا۔ اُس نے اکبر کی درخواست منظور کر لی۔ لیکن یہ
اُسکے لئے آخر میں خطرناک زہر ثابت ہُوا۔ اُسکے سپاہی موقع
اور مصلحت کو نہ سمجھ سکے۔ وہ اِس خیال میں تھے کہ فتح ہمارے
ہاتھ ہے اور اکبر کی فوج کے قدم بس اب اُکھڑا ہی چاہتے ہیں
کہ اتنے میں اُن کو ہاتھ روک دینے کا حکم ہُوا۔ وہ غُصّہ سے پیچ
و تاب کھانے لگے۔ اُن کو طرح طرح کی بدگمانیاں ہونے لگیں
چاند سُلطانہ کے دشمن تو تاک میں تھے ہی یہ افواہ اُڑا دی
کہ چاند سُلطانہ نے خود ہی مُغلوں کو احمد نگر میں داخل ہونے
کی اجازت دی ہے۔

چاند بی بی جنگ کو بند کر کے اپنی خلوت میں بیٹھی ہوئی
تھی کہ یکایک بددل اور بدگمان فوج کے سپاہی اُس میں گھس
آئے اور شریف اور دلیر چاند بی بی کو جو ابھی ابھی میدانِ جنگ میں

میں دوش بدوش اُن کے ساتھ تھی۔ اور اپنے جوش و استقلال
سے اُن کا دل بڑھا رہی تھی قتل کر دیا۔

یہ تھا چاند بی بی کا حسرت ناک انجام۔ اُسکے کارنامے
تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے اور ہر زمانے میں اُس کا نام احترام
اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔

(۳)
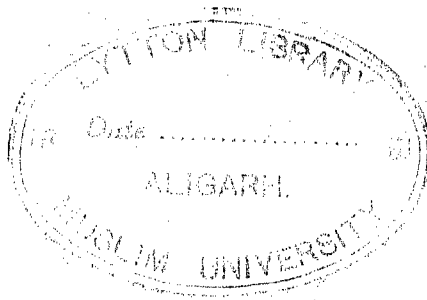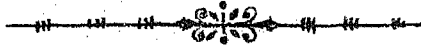
تارا بائی

تارا بائی کا شمار اُن عورتوں میں ہے جنھوں نے اپنے ذاتی نام ونمود اور فلاح وبہبود کے لئے بڑے بڑے کارنمایاں کئے ہیں۔ اُس نے نہ ملک کی کوئی خدمت کی اور نہ قوم کے لئے کچھ گنوایا۔ پڑھنے والوں کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تارا بائی نے جو کچھ کیا وہ اپنے بیٹے کے لئے کیا، اور اس لئے اُسکا نام ہندوستان کی جانباز عورتوں کی فہرست میں نہ ہونا چاہیے لیکن جس دوربینی اور سُوجھ بُوجھ کیساتھ اُسنے اپنا کام کیا۔ اور جس دلیری مع استقلال کا ثبوت دیا اُسکو دیکھتے ہوئے تارا بائی کا شمار ملک کی نامور عورتوں میں نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

تارا بائی ایک مرہٹہ سردار ہمیر راؤ کی بیٹی اور سیواجی کے

دوسرے بیٹے راجہ رام کی بیوی تھی۔ علاوہ تارا بائی کے راجہ رام کی کئی اور بیویاں بھی تھیں۔ جانکی بائی تو مرچکی تھی۔ مگر راجس بائی اور امبکا بائی تارا بائی کی شادی کے وقت زندہ تھیں۔ چند سال بعد اُس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُسکے مشہور دادا کے نام پر شیواجی رکھا گیا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مرہٹے مُغلوں سے لڑ رہے تھے۔ اس جنگ آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کو اورنگ زیب کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ راجہ رام دکن کی طرف بھاگا۔ اور جنجی میں پناہ لی۔ جب کچھ اطمینان ہوا تو اُسنے اپنی رانی تارا بائی کو بھی وہیں بُلوا بھیجا۔ کالکمن کے کنارہ دھرے ہوئے تارا بائی مع اپنے ساتھیوں کے پانڈیچری پہونچی۔ راجس بائی کے بھی ایک بیٹا تھا اُسکا نام سُمبھاجی تھا۔ اور وہ ۱۶۹۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ امبکا بائی سے بیٹی ہوئی تھی جو کم سنی ہی میں

ناں کی کو دخالی کرگئی تھی۔ مغلوں نے جنجی کو بھی گھیر لیا۔ مگر اس پر قابض نہ ہو سکے۔ راجہ رام بھاگ کر مہاراشٹر پہونچا اور وہاں سے مغلوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ مگر روز کی لڑائی اور روز کے اندیشوں نے اسکی تندرستی میں گھن لگا دیا۔ آخر کار سنہ ۱۷۰۰ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔

راجہ رام، سیواجی کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ساہو جو دراصل وارث تھا مغلوں کی قید میں تھا۔ راجہ رام محض اسکا قائم مقام تھا۔ اب یہ سوال درپیش ہوا۔ اسکے دو بیٹے تھے۔ ایک تو سیواجی جو تارا بائی سے تھا۔ اور دوسرا سمبھاجی جو امبکا بائی کے پیٹ سے تھا۔ دونوں پنڈالا میں مقیم تھے۔ امبکا بائی تو شوہر کی نعش کے ساتھ ستی ہو گئی تھی۔ رہ گئی تارا بائی، اس نے اپنے کام میں دیر نہیں کی۔ درباریوں سے کہا کہ "سیواجی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلو" چند نمک حلال درباریوں کو عذر ہوا۔ انھوں نے کہا

کہا۔ "سا ہو کی غیر موجودگی میں تم خود اسکی نیابت کرسکتی ہو۔ بیٹے کو گدی پر بٹھانے کا تم کو کیا حق ہے؟" رانی یہ سنکر آگ بگولا ہوگئی۔ اُن درباریوں کو تو قیدخانہ میں ڈال دیا، اور دوسروں کی مدد سے سیواجی کی رسم تاجپوشی دھوم دھام سے ادا کی۔ سیواجی ثانی ۱۷۰۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اُسی زمانہ میں بھوانی بائی کے ساتھ اسکی شادی رچائی گئی۔ تارابائی نے بڑی دوراندیشی سے کام لیا اور راجس بائی اور اُسکے بیٹے سمبھاجی کو قید کردیا۔

اب تارابائی اس قابل تھی کہ مغلوں کا سامنا کرسکے۔ تارابائی اپنے بہادر باپ کے سارے جنگی ہتھکنڈوں سے واقف تھی۔ جرأت و دلیری، جفاکشی اور چستی و چالاکی تو اسکو ترکہ میں ملی تھی۔ ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ اور ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ تک ہوا سے باتیں کرتی ہوئی جاتی تھی۔ تھکنا تو گویا جانتی ہی نہ تھی۔ اسوقت اسکی زندگی ایک معمولی سپاہی کی زندگی تھی۔ دن ہو تو جیتے تھے

سورج کی کوئی پروا نہیں۔ رات ہے تو زمین پر پڑ رہنے میں کوئی
عار نہیں۔ جہاں دیکھو تارابائی موجود، ہر وقت تازہ جنگ کی
تیاریوں میں مصروف۔ درباریوں اور سپاہیوں پر اسکی بہادری اور
مستعدی کی دھاک بیٹھ گئی۔

اورنگ زیب کو کبھی خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ تارابائی
اپنے دُھن کی ایسی پکّی نکلے گی۔ عورت ذات اور مغلوں سے مقابلہ
کیسی بے تُک بات تھی؟۔ آخر کار اُسنے بھی داؤں پیچ نکالے۔
اُس نے ساہو کو مجبور کیا کہ وہ مختلف مرہٹہ سرداروں کو خط لکھ کر
اُن سے حلف لے کہ وہ مُغلوں کا ساتھ دیں گے۔ غرض صرف یہ تھی
کہ مرہٹہ سرداروں میں پھوٹ کا بیج پڑ جائے۔ ساہو خود مرہٹوں
کو راہ پر لگانے کے لئے روانہ ہوا۔ تارابائی کو بیٹے کی حکومت
سنبھالنے میں بے حد زحمت اُٹھانا پڑی۔

شیواجی غبی اور کمزور تھا۔ ایسے احسن بائی نے بھی اپنے

بیٹے سمبھاجی کی خاطر تاج و تخت کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ خانہ
جنگیاں چھڑنا ہی چاہتی تھیں کہ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ساہو
سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ ادھر تارا بائی کے ہوا خواہوں
نے دامن سمیٹا اور ایک ایک کر کے ساہو کی طرف ہو گئے۔ مگر
تارا بائی نے پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ اس نے اب یہ خبر اڑا دی
کہ اصلی ساہو تو زندہ ہی نہیں رہا۔ اسکو تو مرے عرصہ ہوا۔ اپنے
آدمیوں سے کہا کہ دودھ اور ابلتے ہوئے چاول پر قسم کھاؤ اور
وعدہ کرو کہ جیتے جی میرے بیٹے کا ساتھ نہ چھوڑو گے۔ ان میں چند
ہی لوگوں نے تارا بائی کے کہنے پر عمل کیا اور قسم کھائی۔ بہتیروں نے
تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ساہو کے دنیا سے چل بسنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا

اس اثنا میں ساہو بھی منزلیں طے کرتا، لوگوں سے دوستی
پیدا کرتا، مارا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اسکے ساتھ یوں آدمیوں کی کافی تعداد
تھی اور مرہٹہ سردار بھی اسکا ساتھ دینے کا حتمی وعدہ کر چکے تھے۔

ساہو قلعہ پر قلعہ فتح کرتا آخر کار پنہالا میں داخل ہو گیا۔ تارا
بائی وہاں سے رنگانا بھاگی۔ پنہالا فتح ہو چکا تو ساہو نے
رنگانا کی سمت باگ موڑی۔ رنگانا کی قلعبندی معمولی نہیں تھی
ساہو ناکام رہا۔ زور تو ایڑی چوٹی کا لگایا، مگر قسمت میں فتح تو
تھی نہیں۔ قلعہ ہاتھ آتا تو کیونکر؟ مجبوراً اپنا سا منھ لیکر پلٹ آیا۔
پھر کیا تھا، تارا بائی کی قسمت کا ستارہ ایک مرتبہ پھر چمک اٹھا
اُسکی مُردہ اُمیدوں میں جان پڑ گئی، اور یہاں تک دل بڑھا کہ
پنہالا پر دھاوا مارا اور بات کی بات میں قبضہ کر لیا۔ اُس نے
قلعہ کے سپاہیوں کو رشوت دیکر اپنا بنا لیا۔ پھر تو اُسکے راستے
میں کوئی کانٹا نہ رہا۔ اِدھر سے اطمینان کر کے کولھاپور کا رُخ
کیا، اور اُسکو مرہٹہ سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا۔ وہاں سے چاروں
طرف گماشتے دوڑا دئے۔ اُنکا کام لوگوں کو ساہو کے خلاف
بھڑکانا تھا۔

تارا بائی کا مقصد تو فقط اتنا تھا کہ وہ لوگ جو ساہو کے ساتھ ہو گئے تھے یا تو خود مختار اور آزاد ہو جائیں، یا مغلوں کے ساتھ ہو رہیں۔ اکثر مرہٹہ سرداروں نے یہی کیا کہ وہ یا تو خود مختار ہو گئے یا انعام و اکرام کے لالچ میں مغل شہنشاہ کے طرفدار ہو گئے۔ اس طرح ایک عورت کی جاں توڑ کوششوں نے ساہو کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کہاں دو سال پیشتر اتنا عروج ہوا کہ ساہو کی قسمت کا ستارہ اوج کمال پر چمکتا نظر آ رہا تھا۔ یا اب زوال آیا تو ایسا کہ لے دے کر ایک ستارہ کا خطہ اُسکے قبضہ میں رہ گیا تھا۔ یا پھر اطراف کے چند چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعے۔ جو وفادار افسروں کے ہاتھ میں تھے۔

ذرا سی بات میں تارا بائی کی قسمت پھر پلٹ گئی۔ اِسکو مُقدر کی خوبی کہئے یا زمانہ کا انقلاب۔ شنکر نرائن جو بہادری میں یکتا تھا۔ اور دُنیا جس کی جواں مردی کا گیت گاتی تھی، اب تک

تارابائی کا خیر خواہ اور طرفدار تھا، اُسکو اب تک پورا یقین تھا
کہ اصلی ساہو زندہ نہیں ہے۔ جب یہ راز کھل گیا کہ تارابائی نے
سب کو دھوکا دے رکھا ہے تو اُس نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ ساہو
کا وزیر اور اُسکا خاص مشیر بالاجی وشوناتھ ذات کا برہمن تھا
وہ بڑا فسادی تھا۔ اُس نے سازشوں کا جال پھیلانا شروع
کر دیا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ جب تک تارابائی کولھاپور میں ہے
ساہو کی دال گلنا محال ہے۔ اُس نے راجہ رام کی بیوہ راجس
بائی کو پیغام بھیجا کہ "اگر تم تارابائی اور اُسکے بیٹے کو کسی طرح زک
دے دو تو میں ساہو کی طرف سے تمھاری مدد کا وعدہ کرتا ہوں"
راجس بائی نے اس پیام کو اپنی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا۔ فوراً
کمر ہمت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ سنہ ۱۷۱۲ء میں کولھاپور کے اُمرا
کی مدد سے پنہالا کے محافظوں کو کچھ دے دلا کر اپنی طرف کر لیا۔
تارابائی کی ساری حکومت خاک میں مل گئی۔ اپنی حوصلہ مندی کا

ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا دے سکتی تھی کہ اس نے تارا بائی
اور اسکے بیٹے شیواجی کو قید خانہ میں جھونک دیا، اور اپنے بیٹے
سمبھاجی کو گدی پر بٹھا دیا۔

راجس بائی اور سمبھاجی کو کچھ زیادہ دن عیش و
جشن منانا نصیب نہ ہوا۔ ساہو تو گھات لگائے موقع کا
منتظر تھا ہی۔ فوراً اپنے آدمیوں کو تعینات کیا۔ وہ یکایک
سمبھاجی پر ٹوٹ پڑے۔ بیچارہ کو بھاگتے ہی بنی۔ اب راجس
بائی اور تارا بائی دونوں اُنکے بس میں تھیں، اُنھوں نے
دونوں کو ساہو کے پاس ستارا بھیجدیا۔ ساہو نے بڑی تعظیم
کے ساتھ اپنی ان دونوں بدخواہ ماؤں کا استقبال کیا۔ وہ اُن کو
پنہالا میں عزت و آبرو کے ساتھ نظر بند رکھنا چاہتا تھا۔
تارا بائی کو راجس بائی سے کچھ ایسی کد تھی کہ اسکے ساتھ قید خانہ
میں بھی رہنا گوارا نہ کیا۔ اس نے ساہو سے کہا "میں ستارا

ہی میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ ساہو نے منظور کرلیا۔ اُسکے لئے
قلعہ میں ایک محل تعمیر کرا دیا جس میں تارا بائی نے ساہو کے
مرنے تک زندگی بسر کی۔

ساہو لاولد مرا۔ تارا بائی کے دبے ہوئے حوصلے ایک مرتبہ
پھر اُبھرے۔ قسمت آزمائی کے لئے تیار ہوگئی۔ ساہو کا لاولد
مرجانا کچھ اچھا نہ ہوا۔ وہ سمبھاجی سے مُطلق خوش نہ تھا۔ اگر
تارا بائی کا لڑکا سیواجی ہوتا تو اُسے ضرور اپنا وارث قرار دیتا
مگر موت اُسکا بھی کام تمام کرچکی تھی۔ ساہو کی بیوی سکور بائی
ذرا تُند مزاج تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ ساہو کسی کو گود لے اور اُسی
کو اپنا وارث بنائے۔ اُسے بالاجی وشوناتھ سے بھی عداوت
تھی۔ اسکے خلاف اُس نے ساہو کے کان بھرنا شروع کر دئے
چاہتی تھی کہ برہمن کو ملازمت سے علٰحدہ کر دیا جائے۔ ساہو بھی کسی کو
گود لینا ہی چاہتا تھا کہ تارا بائی کو خبر لگ گئی۔ بڑھاپے نے اسکے

حوصلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اُس نے جان ملبر اجہ سے مُلاقات
کی اجازت طلب کی۔ اور سرھانے آکر بہت کچھ اونچا نیچا سمجھا کر
کہا کہ ایک اجنبی کو گود دے کر گدی پر بٹھا دینا خلاف مصلحت ہے
ابھی تو ایک وارث سلامت ہے۔ گدی اُسے کیوں نہ ملے؟ ساہو جی بجز
سمبھاجی کے اور تو کسی حقدار کو جانتا نہ تھا۔ اُسنے حیرت سے پوچھا
وہ کون؟ تارا بائی نے جواب دیا کہ اُسکے بیٹے سیواجی کی بیوی
بھوانی بائی سے ایک بیٹا ہے۔ جو شوہر کے مرنے کے بعد پیدا
ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اُس نے ایک عجیب قصہ بھی بیان کیا۔ وہ
یہ تھا کہ مہادار اجس بائی، بھوانی بائی کے بیٹے سے کوئی بدسلوکی
کر بیٹھے تارا بائی نے بچہ کو افیون کھلا دی تھی۔ اُسپر ایسی گہری نیند
طاری ہوئی کہ لوگ اُسے مُردہ سمجھنے لگے۔ اسکے بعد اُس نے اسکا
جنازہ بھی نکالا۔ اور بجائے بچہ کے دو مُرغوں کو دفن کر دیا۔ یہ سب کچھ
بچہ کو راجس بائی کے پنجہ سے بچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ساہو کو

تارا بائی نے پورا یقین دلایا کہ وہ بچہ رام راجہ دو راجپوتوں کی آغوش محبت میں پل رہا ہے۔ ساہو تارا بائی کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اُس نے اسکو جھوٹا تو نہیں سمجھا۔ مگر اپنی حیرت دور کرنے کی غرض سے پوچھا "اسکا کوئی ثبوت بھی پیش کر سکتی ہو؟" تارا بائی کسی کام کو ادھورا چھوڑنے والی نہ تھی۔ فوراً راجپوتوں کو لاکر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے تصدیق کی کہ تارا بائی کا بیان حرف بحرف صحیح ہے۔ پھر تو ساہو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اُس نے طے کر لیا کہ رام راجہ ہی راج پاٹ کا مالک ہوگا۔

سکوربائی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی۔ اُسکی نظر ایک ایسے لڑکے پر تھی جو کمزور اور نالائق تھا۔ حکومت کی قابلیت اُس میں بالکل نہ تھی۔ سکوربائی کو پوری اُمید تھی کہ اُس لڑکے کی تخت نشینی سے اُسکا اپنا اقتدار بڑھ جائیگا۔ حکومت کی باگ ڈور اُسکے ہاتھ میں ہوگی۔ اپنی اُمیدوں کو

اس طرح پامال ہوتے دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے
جا کر ساہو سے کہا کہ تمہیں سیدھا سادا سمجھ کر یہ چال چلی گئی
ہے۔ ساہو نے اپنے پیشوا بالاجی کو خفیہ ہدایت دے رکھی تھی
کہ میرے مرنے کے بعد رام راجہ کے سوا کوئی تخت پر قدم نہ
رکھے۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ محل کی نگرانی فوج کے سپرد کی جائے
تاکہ سکوربائی یا سمبھاجی، رام راجہ کے راستہ میں کسی قسم
کی رُکاوٹ نہ پیدا کرنے پائیں۔ یہ وصیت کر کے ساہو "ہری،
ہری، شیو" کرتا سورگ کو سدھارا۔ ادھر ساہو کا دم ٹوٹا۔
اُدھر پیشوا نے آدمیوں کو اُسکے جانشین رام راجہ کو لانے
کے لئے بھیجا۔ اُسے تو تخت پر بٹھایا، اور سکوربائی کو شوہر کی
جانے کے لئے مجبور کیا۔ بالاجی وشوناتھ یہ چاہتا تھا کہ
سلطنت کا مالک خود بن جائے، اور راجہ اُسکے ہاتھ میں
محض کٹھ پتلی بنا رہے۔ اُس نے رام راجہ سے کہا کہ آپ

ابھی بچہ ہیں چین سے سونے کے دن ہیں پینسٹھ لاکھ سالانہ جیب خرچ قبول فرمائیے اور اجازت دے دیجئے کہ میں تارابائی کے ساتھ ہوکر سلطنت کا کاروبار دیکھوں۔ آپ ستارا میں جہاں چاہیں آئیں جائیں۔

رام راجہ کو یہ صلاح پسند آئی۔ مگر تارابائی کب ماننے والی تھی۔ اُس نے جیوں ہی سُنا جل کر خاک ہوگئی۔ وہ تاڑ گئی کہ میرا نام صرف اپنی غرض کے لئے پیشوا نے شامل کرلیا ہے اپنی جگہ پر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ پوتا تو برائے نام بادشاہ ہوگا۔ اصلی حکمراں میں ہونگی۔ مگر اب اُسکی اُمیدیں خاک میں مل رہی تھیں۔ فوراً بالاجی کی مکاری کا جواب سوچ نکالا۔ اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں سنہا گڈھ جاؤں گی، اور اپنی زندگی کے باقی دن اپنے شوہر رام راجہ کی قبر پر گزاروں گی۔ تاجپوشی کے دو ماہ بعد تارابائی قلعہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

سنہا گڈھ کا حاکم چمناجی ایک بہادر سپاہی تھا۔ تارا بائی کا داؤں اُس پر چل گیا۔ حاکم نے پیشوا کو نیچا دکھانے اور نوجوان رام راجہ کو اُسکے پنجہ سے چھڑانے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ بالاجی پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ تارا بائی کا سنہا گڈھ جانا مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ جیوں ہی اس سازباز کی خبر پائی اُس نے چمناجی اور تارا بائی کو دربار میں طلب کیا، اور دھمکایا کہ اگر آنے میں ذرا بھی تامُّل کیا تو سخت سزائیں بھگتنا ہونگی۔ دونوں باغیوں کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ مگر اب کر ہی کیا سکتے تھے؟۔ ناچار حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ بالاجی بھی بڑا چالاک و ذہین تھا۔ اُس نے تارا بائی کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ نذرانہ پیش کیا۔ اور پھر عزّت اور تعظیم کے ساتھ ستارا بھیج دیا۔ اس طرح اُس نے تارا بائی کو چمناجی سے جدا کر دیا۔ اور چمناجی کو قید خانہ میں جھونک دیا۔ لوگ سمجھتے ہونگے کہ تارا بائی نے ہار مان لی۔ مگر ایسا نہیں

اپنی کھوئی ہوئی حکومت کے حاصل کرنے کی دھن اُسے اب بھی
تھی۔ وہ تدبیریں سوچا کرتی تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے غافل نہ
رہتی تھی۔ اسکا آخری فیصلہ یہ تھا کہ چاہے کچھ ہو اب رام راجہ
ہی کو قید کر لینا چاہیئے۔ پھر امراء اور ارکین دربار کی مدد سے پیشوا
کو سر کرنا اتنا دشوار نہ ہوگا۔ اُس نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط
سے اپنی تدبیروں کو عمل میں لانا شروع کیا۔ شیو جی کا مندر
ستارا کے قلعہ کے اندر تھا۔ اسکے درشن کے بہانے اندر جانیکی
اجازت مانگی۔ افسروں اور سپاہیوں کو رشوتیں دیں۔ ہتھیار اکٹھا
کئے، اور رام راجہ کا انتظار کرنے لگی جب وہ واپس آیا اُسکے پاس
یہ کہلا بھیجا۔ "تمھاری دادی تمھیں دیکھنے کے لئے بیتاب ہے، ایک
دن کے لئے کھڑے کھڑے اُسکے پاس بھی ہو جاؤ"۔ رام راجہ کے
فرشتوں کو بھی نہیں خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ خبر ہوتی کیسے؟
یہی دادی تھی جس نے اُسے تخت و تاج دلوایا تھا۔ رام راجہ قلعہ میں

داخل ہُوا - دادی نے محبت بھرے لہجہ میں داخل ہُوا - دادی نے محبت بھرے لہجہ میں "خوش آمدید" کہا - اِدھر جان بچھائے جا رہے تھے - اُدھر نوجوان راجہ شراب و کباب میں لگ گیا - کھا پی کر فارغ ہوا تو دادی سے رخصت ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا قلعہ کے پھاٹک پر پہونچا تو دیکھا کہ در بند ہیں - دیکھتے دیکھتے تارا بائی کے سواروں نے اُسکو گھیر لیا - اور اُسکو قید میں لے لیا - سواروں کا ہجوم بڑھتا گیا - اب راجہ کا شور و غل سب بے سود تھا -

سپاہیوں نے اس سے ہتھیار لے لئے اور تاریک قید خانہ میں ڈال دیا جہاں سے پھر وہ زندہ نہ نکلا - تارا بائی نے اپنے پوتے کو جیتے جی اُسی کال کوٹھری میں رکھا - پیشوا کی قوت اس عرصہ میں جڑ پکڑتی گئی - اُسکا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی کہ بدقسمت رام راجہ قید خانہ میں کیسی بے کسی و بے بسی کی موت مر رہا ہے -

(۴)

پدّنا

آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے چتّور میں ایک راجہ تھا۔ جو رانا سنگرام سنگھ کا پوتا تھا۔ اور بکرما جیت کے نام سے مشہور تھا۔ رعایا اُس سے راضی نہ تھی۔ وہ نہایت بدذات اور بدمزاج تھا۔ دربار کے ذی حیثیت اور باوقار اُمرا کی اُس کی نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی۔ اور اُمرا بھی وہ جو بڑے بڑے بادشاہوں کی نظر میں معزز و ممتاز تھے۔ بکرما جیت کو اپنا سارا وقت سپاہیوں اور پہلوانوں کی صحبت میں ضایع کرنے کی لت تھی۔ سلطنت کے کاروبار سے اُس کو کوئی سروکار نہ تھا کھیل کود کا شیدا تھا۔ اور کسی بات سے مطلب نہ غرض۔

بہادر شاہ گجرات کا فرماں روا تھا بیٹھے بٹھائے چتوڑ
پر آدھمکا اور چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔ وہ تو کہو
خوش قسمتی سے سوتیلی ماں رانی کرُناوتی اُس کی پشت
پناہ بن گئی۔ اُس نے مُغل شہنشاہ ہمایوں کی خدمت
میں درخواست بھیجی کہ "آئیے اور ایک دُکھیا کی داد رسی
فرمائیے۔ مُلک کو دُشمنوں کے پنجہ سے نجات دلوائیے۔
ہمایوں بڑا رحم دل تھا کسی کو مصیبت میں دیکھتا تو
دِل بھر آتا۔ راجپوت شریف زادی کی درخواست نے
اُس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ وہ لشکر عظیم کے ساتھ بہادر
شاہ کی سرکوبی کے لئے آموجود ہوا۔ اور اس کو محاصرہ
اُٹھا لینے پر مجبور کیا۔ رانا بکرما جیت اب چین سے راج
کرنے لگا۔ مگر اپنی مصیبتوں اور بدبختیوں سے کوئی سبق
نہ لیا سلطنت کی طرف وہی بے پروائی۔ اُمرا کے ساتھ

رہی بدسلوکی۔ ایک مرتبہ تو غضب ہی ڈھا دیا۔ کرم چند
اجمیر کا ایک بہادر سپاہی تھا۔ دربار میں اُس سے کوئی
غلطی ہو گئی بکرماجیت اُسے مار ہی تو بیٹھا۔ پھر کیا تھا؟
راجپوتوں کا خون کھول گیا۔ سب بگڑ کھڑے ہوئے اور
ایک دل اور ایک رائے ہو کر اُس سے راج پاٹ چھین
لیا۔ اب پرتھوی راج کے لڑکے بن بیر کے سر پہ تاج رکھا
گیا۔ اور بدقسمت بکرماجیت کو عبرت حاصل کرنے لئے
لئے قید خانہ میں ڈال دیا۔

بکرماجیت کا حقیقی جانشین رانی کرناوتی کا بیٹا
اُدے سنگھ تھا۔ جو ابھی بہت کم سن تھا۔ آپس کی پھوٹ
چتوڑ کو غارت کر رہی تھی۔ ساری ریاست تکا بوٹی ہو کر
رہ گئی تھی۔ درباریوں کو اندیشہ تھا کہ ایسی صورت میں
ایک بچہ کو تخت پر بٹھانا نہ جانے اور کیا کیا تباہیاں لائیگا

اسی مصلحت سے بن بیر کو سلطنت کا تخت و تاج سونپ دیا گیا۔ رانی کرناوتی مر رہی تھی وہ اپنے گود کے بچہ کو پنّا دائی کے سپرد کر کے دُنیا سے چل بسی۔ اور یہ اُمید دُنیا سے اپنے ساتھ لیتی گئی کہ اگرچہ میں مر کے میرا نونہال بچا تو ممکن ہے ایک دن چیتور کا تاج اُسکی پیشانی پر چمکے۔

پنّا تھی تو دایہ مگر وفا کی پُتلی تھی۔ "پنّا" کے معنے "ہیرا" کے ہیں۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس نام سے پکاری جائے۔ اُس نے دُنیا سے رخصت ہوتی رانی سے وعدہ کیا تھا کہ "ننھے شاہزادے کو اپنی اور اپنے دُلاروں کی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ ہر طرح کی مصیبت جھیل لوں گی مگر امانت میں خیانت نہ ہونے دوں گی۔ اُدے سنگھ پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے گی"۔

پنّا کے بھی ایک بچہ تھا جو اُدے سنگھ کا ہم سن تھا۔

پنّا دونوں شیرخواروں کی پرورش ساتھ ساتھ کرتی تھی اُدے سنگھ جیوں جیوں پروان چڑھتا گیا طاقت اور خوبصورتی بھی بڑھتی گئی - دایہ اکثر پُرانے زمانہ کے بہادروں کی کہانیاں اُس کو سُناتی اور اُن کی ہمت و دلیری کے گیت گا گا کر اُس کے جوش کو اُبھارتی - اُدے سنگھ بزرگوں کے کارنامے سُن کر بہت خوش ہوتا - رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں بڑے شوق سے سُنتا تھا - ایک دن جبکہ پنّا بچوں کو کھلا رہی تھی ایک نوکر اُس کے پاس دوڑتا ہوا آیا - پریشانی اُس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی - اُس نے آتے ہی کہا "پنّا! بڑا غضب ہو گیا - بکرماجیت سنگھ قتل کر دیا گیا" پنّا کچھ دیر تک سکتہ میں رہی - وہ جانتی تھی کہ بن بیر ول کا کھوٹا ہے - وہ اصلی جانشین کی زندگی میں اپنے کو محفوظ نہیں سمجھے گا - ڈری کہ بکرماجیت کے بعد وہ

اُدے سنگھ کا کام تمام کرے گا۔ اور ہر ممکن کانٹے کو
اپنی راہ سے دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے پل
بھر میں ایک تدبیر سوچ لی۔ مگر اُس پر عمل کرنا بڑی جرأت
کا کام تھا۔ اُس نے اپنے بچے کو شہزادہ اُدے سنگھ کا لباس
پہنایا اور شہزادہ کے بستر پر لٹا کر کہا "بیٹا سو رہو آج
تم شہزادہ کی جگہ کام آؤ گے۔ بھولے بھالے نادان بچہ
کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اُدے سنگھ سے کہا ہم تم کو
ایک عجیب تماشہ دکھانے لے چلیں گے۔ پھر اُسے مکان
کے ایک تاریک حصہ میں لے گئی۔ اور پھل کی ایک
بڑی سی ٹوکری میں اُسے بٹھا کر کہا کہ خبردار شور نہ مچانا۔
اس کے بعد اُس کو پتوں سے ڈھانک دیا اور ایک ملازم
سے کہا "اس کو قلعہ کے باہر لے چلو۔ میں بھی وہیں سے
تمہارے ساتھ ہو لوں گی۔

پنّا اپنے محل میں آئی جہاں اُس کے جگر کا ٹکڑا شہزادہ کے بستر پر پڑا سو رہا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دروازہ کھُلنے کی آواز کانوں میں آئی، اور پل بھر میں بن بیر ہاتھ میں ننگی تلوار لیئے داخل ہوا۔ پنّا مارے ڈر کے کانپنے لگی۔ بن بیر نے آتے ہی پوچھا۔ "پنّا! جلد بتا اُدے سنگھ کہاں ہے؟" پنّا خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے حواس میں نہ تھی۔ غم اور ڈر نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ بول تو نہ سکی۔ اشارہ سے بتلا دیا کہ "وہ سو رہا ہے" بے رحم اور ظالم بن بیر پلنگ کے قریب آیا۔ تھوڑی دیر تک تو اس بات کا اطمینان کرتا رہا کہ سونے والا اُدے سنگھ ہی ہے زرق برق لباس ہیرے اور جواہرات سے مرصّع ٹوپی اور ریشمی بستر نے اس کے سارے شبہے دور کر دئے اُس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا خنجر بےگناہ بچہ کے

سینہ کے پار کر دیا۔ اور خوش خوش اپنے محل کو چلا آیا کہ اب تخت و تاج کے لئے جھگڑا کرنے والا کوئی نہیں رہا اپنے خیال میں وہ سارے رقیبوں کا خاتمہ کر چکا تھا۔

جیوں ہی بن بیر کمرے سے نکلا۔ پنا لپک کر پلنگ کے قریب آئی اور اپنے بچہ کو چھاتی سے لگا لیا۔ جو کچھ پیش آیا اُسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اُس نے اپنا وعدہ خوب وفا کیا مگر ماں کی مامتا، کہاں تک ضبط کرتی؟ محبت نے جوش مارا آنسو اُمنڈ آئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے اور چلانے کا شور بلند ہو کر محل کی ماماؤں کے کانوں تک پہنچا دوڑ کر سب پنا کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب نے پنا کے غم میں شرکت کی اور بڑی دیر تک بے گناہ بچے کی لاش پر ماتم کرتی رہیں۔ صرف پنا ہی کو علم تھا کہ شہزادہ اُدے سنگھ ظالم بن بیر کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ لوگ سوچ سوچ کر

رو رہے تھے کہ افسوس سنگرام سنگھ کی نسل کا خاتمہ ہو گیا
اُدے سنگھ کے قتل نے اُسکے خاندان کو ہمیشہ کے لئے
نیست و نابود کر دیا۔ مقتول بچہ کا جسم شان و شوکت کے ساتھ
آگ کی نذر کیا گیا۔ جب بچہ کی راکھ پر پنّا خوب دل کھول کر
آنسو بہا چکی تو اُٹھی اور جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی وفادار
ملازم کے پاس پہونچی اور شہزادہ اُدے سنگھ کی دیکھ بھال
میں لگ گئی۔

باوفا غلام چتّوڑ کے پچھم چند میل کے فاصلہ پر ایک دریا
کے کنارے کھڑا تھا اور بے چینی کے ساتھ پنّا کی راہ دیکھ رہا
تھا۔ خوش قسمتی سے بچہ بھی اُس دن خوب سویا اور کوئی اُسکو
دیکھ نہ سکا۔ اُنھوں نے ڈیولا کی راہ لی۔ سنگھ راؤ وہاں کا
راجہ تھا۔ اُنھوں نے اُس سے درخواست کی کہ اُدے سنگھ
کو اپنی پناہ میں لے لے۔ اُنھوں نے بہتیرا سمجھایا کہ سنگرام سنگھ

کے خاندان کا یہی ایک نام لیوا رہ گیا ہے۔ کسی طرح اس کی پرورش ہو جاتی تو اچھا تھا۔ مگر راجہ نے صاف انکار کر دیا۔ بات یہ تھی کہ وہ ڈرتا تھا کہ بن بیر کو معلوم ہوگا تو اچھی طرح خبر لے گا۔ پنّا ہمت ہارنے والی نہ تھی۔ سیدھے ڈونگر پور پہونچی۔ جب راجہ راول اسکرن کو پنّا کی کارگزاریوں کا علم ہوا تو اُس نے کہا "میں اس کو اپنی پناہ میں ضرور لے لیتا۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں راز کھُل گیا تو میری اور شہزادہ دونوں کی جان پر آ بنے گی" پنّا کی درخواست اس طرح یہاں بھی رد ہو گئی۔

ہر جگہ صاف جواب مل رہا تھا۔ پنّا مایوس ہو چلی تھی۔ مگر وہ مستقل مزاج عورت تھی۔ وہ ایسی کم ظرف اور کمزور دل والی عورت نہ تھی جیسا کہ راؤ اور راول تھے۔ وہ عورت ذات تو تھی۔ مگر جو قربانی اُس نے کی تھی وہ اُس کی جرأت

اور بلند حوصلگی کا کافی ثبوت تھی۔ وفاداری اور استقلال
کو اپنی اور اپنے بچہ کی جان سے کہیں زیادہ عزیز رکھتی تھی۔
اُس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اراول پہاڑ کی پیچ در پیچ وادیو
کو طے کرتی ہوئی میدان کے جنگلی باشندوں یعنی بھیلوں کی مدد
سے وہ کومل میر پہونچی اور فوراً وہاں کے حاکم کو پیغام بھیجا
کہ "میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں" حاکم کا نام آساساہ تھا۔
وہ جینی تاجروں کے قبیلہ سے تھا اور بڑا خلیق اور خداترس
تھا۔ جب پنّا اُس کے سامنے آئی تو اُس نے شہزادے کو
اُس کی گود میں ڈال دیا اور کہا "اپنے بادشاہ کی جان کی
حفاظت کیجئے" اور پھر سارا ماجرا حرف بحرف کہہ سنایا۔
یہاں بھی وہی صورت پیش آنے والی تھی کیونکہ آسا
ساہ نے جب ساری باتیں سُنیں تو حواس باختہ ہو گیا۔ قریب
تھا کہ اپنی معذوری بیان کر کے اس بلا کو اپنے سر سے ٹال دے

کہ اُس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اُس نے
کہا "بیٹا! وفاداری اور صداقت میں خطروں اور مشکلات
کا ڈر کیسا؟ یہ شاہزادہ سنگ رام سنگھ کی یادگار ہے اور
یہی تمھارا اصلی بادشاہ ہے۔ خدا چاہے گا تو انجام اچھا
ہی ہوگا۔"

آساساہ اپنی بُزدلی اور بے حمیتی پر بہت نادم ہوا
بہادر ماں کے جوش بھرے الفاظ نے اُس کا دل بڑھا دیا۔
اُس نے شاہزادہ کو اپنی پناہ میں رکھنے کا وعدہ کرلیا۔ اور
لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے کی غرض سے مشہور کردیا کہ یہ
میرا بھتیجا ہے۔

پنّا اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکی تھی۔ اُس نے
اب کومل میر سے رخصت ہونے کا قصد کیا۔ کیونکہ وہ جانتی
تھی کہ اس کا یہاں ٹھہرنا لوگوں کے دلوں میں شک پیدا

کر دے گا - وہ وہاں سے چل دی - شاہزادہ جوں جوں جوان
ہوتا گیا اُسکی صورت سے شاہانہ جلال ٹپکنے لگا - آخرکار راز فاش
ہوگیا اور دور و نزدیک یہ افواہ پھیل گئی کہ کومل میر کے حاکم
کا بھتیجا دراصل اُدے سنگھ ہے - چتوڑ والوں کو جب خبر ہوئی تو
جان میں جان پڑ گئی - درباری اور اُمراء بن بیر کی حکومت سے
یوں ہی تنگ آ گئے تھے - وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ اُن کے
سر سے یہ بلا ٹلے - لوگ اس خوشخبری کی تصدیق کیلئے چتوڑ
سے کومل میر پہونچے - اور اپنے شاہزادے کو پہچان لیا - پنّا نے
بھی اپنے واقعات اُن لوگوں کو سُنائے - وہ اپنی قربانی اور
جاں فشانی کا پھل اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ
تھی - لوگ اُدے سنگھ کو چتوڑ لائے اور بڑی دھوم دھام سے
اُسکی تاجپوشی ہوئی -

(۵)

سنجوگتا

بارہویں صدی میں ایک چھتری راجہ جس کا نام انگپال تھا دلی میں راج کرتا تھا۔ وہ سارے ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ خدا نے اُسے کوئی اولاد نرینہ نہیں دی تھی محض دو بیٹیاں تھیں جو دو بہادر راجپوت سرداروں کو منسوب تھیں۔ اُن میں ایک تو "راٹھور" نسل سے تھا اور قنوج کا مالک تھا۔ دوسرا "چوہان" تھا اور اجمیر کا والی تھا۔ انگپال کے جب کوئی بیٹا تھا ہی نہیں تو پھر تخت و تاج کا وارث کون ہوتا؟ ہاں اُس کی مرضی پر منحصر تھا جس کو راج پاٹ سونپ دے۔ اُسکی دونوں بیٹیوں سے دو بیٹے تھے۔ جے چند راور پرتھوی راج۔ جے چند پہلی لڑکی

سے تھا اور پرتھوی راج سے عمر میں چند سال بڑا بھی تھا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ تاج شاہی ایک روز میری پیشانی پر چمکتا ہوگا لیکن قسمت کسی کی لونڈی نہیں۔ اننگ پال کی وصیت سے دہلی کے تخت و تاج کا مالک پرتھوی راج ہوا اور جے چندر کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ پرتھوی راج کا انتخاب موزوں بھی تھا۔ اُس میں شہریاری کی ساری صفتیں موجود تھیں۔ اُسکی شریف النفسی، جرأت، دلیری اور اچھے اطوار نے شہنشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ غرضکہ جب اننگ پال عالم جاودانی کو سدھارا تو اُسکی جگہ پرتھوی راج جلوہ افروز ہوا۔

جے چندر کو جب پرتھوی راج کے تخت نشیں ہونے کی خبر ہوئی تو وہ حسد کی آگ میں جل مرا۔ اُس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسے کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا

تھا کہ میں اس بُری طرح نظر انداز کر دیا جاؤں گا۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ دونوں بھائیوں میں وہی بڑا تھا، اُسے یقین تھا کہ تخت شاہی میرے قدموں تلے ہوگا اور صدہا باج گزار سرداروں کی گردنیں میرے سامنے خم ہوں گی۔ اس واقعہ نے اُس کے خیالی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور اُس کے ارمانوں کے قلعہ کو پل مارتے زمین پر گرا دیا۔ وہ غُصّہ سے بھُن اُٹھا اور پرتھوی راج کو اپنے حقوق کا غاصب سمجھنے لگا۔ اُس نے پرتھوی راج سے انتقام لینے کی ٹھان لی محض موقع اور وقت کا انتظار تھا۔

دو ہندو سرداروں کی باہمی رقابت نے ہندوستان کو خاک میں ملا دیا۔ اُسی زمانہ میں مُلک غور میں کہ ہندوستان کے شمال اور مغرب میں واقع ہے ایک باہمت اور باحوصلہ شخص جس کا نام شہاب الدین محمد غوری تھا برسرِ حکومت

تھا۔ اپنے پیشرو محمود غزنوی کی طرح اُس کے دل میں بھی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کو لوٹنا چاہئے۔ اور ممکن ہو تو ملک پر بھی قبضہ کرنا چاہئے۔ اب تک تو راجپوتوں کی دلیری نے اُسکے حوصلہ کو پورا نہ ہونے دیا تھا۔ اُسے "راٹھور" اور "چوہان" کی باہمی عداوت کی خبر ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا؟ حالات اُس کے ہر طرح موافق تھے۔ اُس نے آناً فاناً ایک لشکرِ عظیم تیار کر لیا۔ اور دریائے سندھ کو پار کر کے تھانیسر کے میدان میں آ دھمکا۔

غوری کے حملہ نے سارے ہندوستان کو بیدار کر دیا۔ تمام راجپوت بہادر اپنی اپنی مددگار فوجوں کو لے کر پرتھوی راج کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اُن کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارا دھرم خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اور اس خیال کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے دھرم کی حمایت پر کمر باندھ لی۔

پرتھوی راج کم سن تھا مگر اُس کی ہمت اور لیاقت کا
چاروں طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ وہی تمام فوجوں کا سردار
بنایا گیا۔ اُس کے ماتحت تمام فوجیں غوری کے حملہ کو روکنے
کے لئے تھانیسر کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک اکیلا جے چند
تھا جو اُس مہم میں شریک ہوا۔ وہ پرتھوی راج سے اتنا
جلتا تھا کہ اُس نے اپنے خاندان کا ناموس بچانے کیلئے
پرتھوی راج کا ساتھ نہیں دیا۔

تھانیسر کی جنگ جو راجپوتوں اور غوری کے
سپاہیوں میں ہوئی صرف بارہ گھنٹہ تک جاری رہی۔
ہر طرف بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھلائے جا رہے
تھے۔ اس میں طرفین کی فوجوں نے نقصان عظیم برداشت
کیا۔ نہ تو پٹھان ہی ہارتے نظر آتے تھے اور نہ راجپوت
دیر تک مقابلہ برابر کا رہا۔ پٹھان جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔

غوری نے ٹھان لیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہندوستان پر
قبضہ ضرور ہو گا۔ راجپوت بھی اپنے ملک اور دھرم کی حمایت
میں کچھ کم دلیری سے کام نہیں لے رہے تھے۔ آخر کار جب
آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی چھانے لگی تو اس جنگ کا
بھی فیصلہ ہو گیا۔ فتح کا سہرا راجپوتوں کے سر رہا۔ غوری اور
اُس کی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔

فتح کی خبر سُن کر سارے ہندوستان میں خوشی کے
نعرے بلند ہونے لگے۔ مگر جے چند رملول تھا۔ وہ اس وجہ سے
نہیں کہ ہندوؤں کو فتح نصیب ہوئی، بلکہ اس وجہ سے کہ فتح
پرتھوی راج کے ہاتھوں ہوئی۔ پرتھوی راج کی بہادری
کی تعریف سُنا تو اُس کے زخمی دل کو ٹھیس سی لگ گئی۔
اور بھاٹوں کا اُس کی مدح میں گیت گانا تو زخم پر نمک
چھڑک رہا تھا۔ اُس کی اپنی لڑکی سنجوگتا کا اوروں کے

ساتھ جشن منانا اور پیغام فتح سُنانے والے کو موتی کا ہار نذر کرنا کھولتے تیل پر پانی کا کام کر گیا۔ غرضکہ اُس کے غصہ کی آگ ہر طرح بھڑکتی ہی گئی۔

قنوج کے راجہ جے چندر کے صرف ایک بیٹی تھی نام اُس کا سنجوگتا تھا۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک ہندوستانی عورت میں ہونا چاہیئے۔ چاند جو دربار کا شاعر تھا سنجوگتا کے حُسن کے گیت گایا کرتا تھا۔ جب تک دُنیا قائم ہے اُسکے حسن و جمال کا چرچا ہوتا رہے گا۔ پرتھوی راج کی شرافت اور بہادری کا سنجوگتا کے دل پر کافی اثر ہو چکا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دل میں گھر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ تھانیسر کے میدان میں جس دن سے پرتھوی راج کو کامیابی نصیب ہوئی اُسی دن سے وہ سنجوگتا کے دل میں بس گیا۔ دن ہو یا رات سنجوگتا کے

دل میں پرتھوی راج کی یاد رہتی تھی۔ اُسکی تصویر ہر وقت نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اُسکی جانبازی اور دلیری کے قصوں کے سوا کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ جے چند نے سنجوگتا کو اس خیال سے باز رکھنے کی کیا کیا کوششیں نہیں کیں۔ اُس نے ہر چند چاہا کہ لڑکی پرتھوی راج کی محبت کو دل سے دور کر دے مگر ہر کوشش بیکار اور ہر نصیحت رائگاں ثابت ہوئی۔ اب وہ شادی کے قابل تھی۔ جے چند کو مناسب بر کی تلاش ہوئی۔ راجپوتوں کے دستور کے مطابق اُس نے سوئمبر کا اعلان کیا۔ یہ ایک رسم تھی جس میں ہندوستان کے تمام راجہ اکٹھا ہوتے اور لڑکی ایک ہار لے کر تمام راجاؤں کے پاس سے ہوتی ہوئی گزرتی تھی۔ جو راجہ اُسکو پسند ہوتا وہی اُس ہار کا اہل ہوتا۔ لڑکی گلے میں ہار ڈال دیتی۔ اس طرح لڑکی اپنا

شوہر خود منتخب کرلیتی - ایک پرتھوی راج ہی ایسا راجہ
تھا جو سنجوگتا کے سوئمبر میں نہیں بلایا گیا - اُسکی ذلت اور
توہین میں جے چند رنے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا - پرتھوی
راج کی ایک مورت جو دیکھنے میں نہایت بدنما تھی صدر
دروازہ پر بجائے دربان کے نصب کرادی - یہ ایک ایسی توہین
تھی جو کسی طرح پرتھوی راج جیسے سورما کے شایان نہ تھی
پرتھوی راج کی ذلت اور توہین سے سنجوگتا کے دل
پر سخت چوٹ لگی - اُس کو بڑا صدمہ ہوا - سوئمبر بغیر پرتھوی
راج کے اُسکے لئے بیکار تھا - وہ اپنی جان اور اپنا دل بہادر
پرتھوی راج کی نذر کر چکی تھی - جے چند سنجوگتا کے دل
کی اصلی حالت سے بیخبر تھا - اور بیٹی کی محبت کو کرودھی کے
اُبال سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا - وہ تو اس خیال میں تھا کہ ادھر
سنجوگتا نے سوئمبر میں کسی شہزادے کو پسند کیا اُدھر پرتھوی راج

کی محبت دل سے رخصت ہوئی۔

سوئمبر کا دن نزدیک ہوتا جا رہا تھا شہزادوں اور امیروں کی آمد قنوج میں شروع ہو گئی۔ اُن کو مختلف محلوں میں ٹھہرایا گیا۔ مگر سنجوگتا کی کیا حالت تھی؟ اُسکا دِل دھڑک رہا تھا۔ "کیا ایک اچھوت کی لڑکی اپنے باپ کی خواہش پر اُس شخص کی محبت کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہو گی جسے وہ اپنا دل کب کی سونپ چکی ہو؟" نہیں! اور کبھی نہیں! وہ اپنے دل میں کہا کرتی "میری محبت خواب و خیال نہیں ثابت ہو گی۔ یہ کڑھی کا اُبال ہو کر نہ رہے گی۔ میری محبت سچی محبت ہے جو میرے اور پرتھوی راج کے درمیان ایک مضبوط زنجیر ہے۔ اپنا سرتاج کسی اور کو منتخب کرنا درکنار، اس کا خیال بھی دل میں لانا گناہ اور بدترین گناہ ہو گا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اپنی جان سے ہاتھ

دھو بیٹھوں گی۔ مگر شادی کروں گی تو پرتھوی راج کے
ساتھ اور کسی کے ساتھ نہیں۔ آخری تجویز اُس نے یہ سوچی
کہ ایک قاصد چوہان کے سردار کے پاس اس پیغام کے ساتھ
بھیجے کہ "محبت کی حفاظت منظور رہے تو پرتھوی راج وقت
پر مدد کے لئے آجائے اور سنجوگتا کو وہاں سے لے جائے"
اظہار محبت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ وہ طریقہ
تھا جس پر شہزادی رُکمنی نے اپنے مالک کرشن سے اظہار
محبت کرنے کے وقت عمل کیا تھا۔

اس تجویز کے چند ہی منٹ بعد اُس نے ایک معتبر
قاصد کو بلایا اور جو اُس نے لکھ رکھا تھا اُسکو حوالہ کر کے
تاکید کی کہ جلد جاؤ۔ پرتھوی راج کو یہ خط دو اور جواب لاؤ۔
قاصد صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوا سے باتیں کرتا ہوا پرتھوی
راج کے پاس پہونچا اور ملاقات چاہی۔ پرتھوی نے اُسکو

اندر بُلا لیا۔ قاصد نے امانت سپرد کی۔ پرتھوی راج نے
خط کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ ہر دفعہ آنسو اُسکی آنکھوں میں
چھلکنے لگتے۔ جب اُسے خیال آتا کہ سنجوگتا اُسکی محبت میں کس قدر
بے قرار ہے تو اُسکا دل بھر آتا۔ جب وہ سوچنے لگتا کہ شہزادی
نے اپنی قسمت کا بیڈھب فیصلہ کیا ہے، اور اگر اُس نے
پہنچنے میں دیر کی تو جان پر کھیل جائیگی، تو اُس کا جی سن سے
ہو جاتا۔ پرتھوی راج نے جواب میں اتنا لکھ کر ہرکارے کے حوالے
کیا کہ "دل شکستہ نہ ہو۔ یقین رکھو کہ پرتھوی راج تم سے غافل
نہیں ہے اور نہ وقت پر تم اُسکو غافل پاؤ گی"۔

پیغام لانے والے کو تو اُس نے رخصت کر دیا۔ خود
سب سے تیز گھوڑے پر سوار ہوا اور چوٹی کے سپاہیوں کو ساتھ
لے کر قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھیک اُس وقت جبکہ
آفتاب کی گلابی کرنیں آسمان کے مغربی اُفق پر اپنا رنگ جما

رہی تھیں بہادر راجپوت سوار قنوج میں داخل ہوئے۔
اُن کو سوداگر کا بھیس اختیار کرنا پڑا تب شہر کے اندر گزر
ہوا۔ شہر میں داخل ہو کر سوئمبر محل کے قریب ڈیرے ڈال دیے

آخر وہ صبح بھی آئی جس دن مہمان راجاؤں کی قسمتوں
کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ لوگ سوئمبر کی تقریب میں جوق جوق
شہر کی گلیوں میں جمع ہونے لگے۔ بچے بھی کھیل کود بھول
گئے تھے اور سوئمبر محل کے قریب ٹھٹ لگائے ہوئے تھے
اُس روز شہر کی گلیاں اور مکانات دل کھول کر آراستہ کیے
گئے تھے۔ خود سوئمبر محل کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔
شاہزادے وقت معینہ پر سوئمبر محل میں آکر اپنی اپنی جگہ
پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ ہر شاہزادہ کی یہ کوشش
تھی کہ وہ دوسروں سے لباس میں حُسن میں اور تمام خوبیوں
میں شاہزادی کی نگاہوں میں بڑھ جائے۔ ہر شاہزادہ کے

دل میں یہی حسرت تھی کہ شاہزادی اُسے پسند کرلیتی۔
خدا خدا کرکے انتظار اور بے چینی کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔
ہر طرف سے شور اُٹھا کہ "شاہزادی وہ آرہی ہے"۔ سنجوگتا
مع چند خواصوں کے زرق برق لباس میں سوئمبر محل کے اندر
داخل ہوئی۔ اُسکے زرکار لباس اور بیش بہا زیور اُس کے
حُسن خداداد کو اور بھی چار چاند لگائے ہوئے تھے جبس وقت
نازک اور خوبصورت ہاتھوں میں ہار لئے ہوئے وہ ایک
شاہزادے کے پاس سے ہوتی ہوئی دوسرے کے قریب
آتی اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور وہ دل میں دُعا
کرتا کہ کاش مجھ سے آگے قدم نہ بڑھاتی۔ مگر اُن میں سے کسی
کو بھی اسکا علم نہ تھا کہ سنجوگتا کے ہاتھ کا ہار کسی اور کی
گردن کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ سب کے سب دم بخود تھے۔ سنجوگتا
جب کسی شاہزادے کے سامنے آکر کھڑی ہوتی تو اُس کی

خادمہ اُسے تفصیل کے ساتھ شاہزادے کی بہادری کے
کارنامے سناتی۔ اِس طرح شاہزادی مسکراتی ہوئی آخری
شاہزادے کے قریب آئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ
شاہزادہ بازی لے گیا۔ مگر لوگوں کی ٹکٹکی بندھی رہ گئی جب
اُنھوں نے دیکھا کہ وہ شاہزادہ بھی اُن سے کچھ کم بدقسمت
نہیں ہے۔ شاہزادی تھوڑی دیر ٹھٹھکی اور پھر اِدھر اُدھر
نظر دوڑانے لگی۔ گویا وہ کسی اور کو تلاش کر رہی تھی۔
جے چند راور اُسکے مہمانوں میں سے کسی کی سمجھ میں
یہ بات نہ آئی کہ شاہزادی کا اصل منشا کیا ہے؟ وہ چاہتی
کیا ہے؟ اُسے جستجو کس کی ہے؟ لیکن اُنکی یہ حیرت بہت
جلد دور ہو گئی۔ شاہزادی یکایک صدر دروازہ کی
طرف مڑی۔ اُسکی نگاہیں پرتھوی راج کی اُس مورت پر
پڑ رہی تھیں جو اسوقت جے چند کے محل کی دربانی کر رہی

تھی۔ سنجوگتا نے تیزی کے ساتھ قدم اُٹھایا۔ اور دیکھتے دیکھتے
ہار اُسی مٹی کی مورت کے گلے میں تھا۔ ٹھیک اُسی وقت
ایک نوجوان سوار مجمع کو چیرتا پھاڑتا سامنے سے نمودار ہوا
اور پل مارتے سنجوگتا کو اپنی آغوش میں لے کر گھوڑے پر
بٹھایا۔ اور مع اپنے ہمراہیوں کے جو اُسکے پیچھے پیچھے تھے
گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا یہ جا وہ جا نظر سے اوجھل ہو گیا۔
یہ بہادر نوجوان سوار پرتھوی راج کے اور کون ہو سکتا تھا؟
قنوج کے بہادر تلواریں تول کر آگے بڑھے۔ چاہتے تھے کہ اس
گستاخی کا مزا پرتھوی راج اور اُسکے ساتھیوں کو چکھا دیں
مگر راٹھور بہادر بھی اُن کے مقابلے سے کب بھاگتے تھے۔
کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف سے تلواروں کے ہاتھ چلنے
لگے۔ مگر سانپ نکل چکا تھا۔ زمین پر لاٹھی مارنا بیکار تھا۔
پرتھوی راج سنجوگتا کو لئے ہوئے سیدھا دہلی پہنچ گیا۔

پورے ایک سال تک پرتھوی راج اور سنجوگتا نے دل کھول کر خوشیاں منائیں۔ ایک لمحہ کی جدائی انکے لئے ایک سال ہوجاتی۔ کسی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر ان کے اچھے دن اب رخصت ہونے کو تھے۔

جے چندر کے دل میں پرانی آگ اب بھی سلگ رہی تھی بلکہ اب تو شعلے بھڑک اُٹھے تھے پرتھوی راج کی زبردستی اور دلیری ایسی نہ تھی جس کو جے چندر ٹھنڈے کلیجے برداشت کر لے جاتا۔ حسد اور نفرت نے جے چندر کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ پرتھوی راج کی دشمنی میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس اندھے پن میں اُس سے ایک ایسی حماقت سرزد ہوئی جس سے تاریخ کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں اور جس کی تلافی کسی صورت سے ممکن نہیں۔

اُس نے محمد غوری کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آئے، دہلی فتح کرے جے چندر بھی اُس کی مدد کے لئے حاضر ہے۔ محمد غوری کے لئے یہ خط جنت کے پروانے سے کم نہ تھا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ راجپوتوں کی باہمی رنجش یقیناً اُسکے لئے فتح کا پیغام ہے۔

ایک مرتبہ تھانیسر کے میدان میں پٹھان فوج پھر آ جمی۔ جے چندر اپنے راجپوت جوانوں کے ہمراہ دشمنوں میں جا ملا۔ غوری نے اُس کی خاطر مدارات میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ مگر پرتھوی راج اور سنجوگتا کے لئے یہ خبر تیر و نشتر کا کام کر گئی۔ اُن کی نظروں میں اب جے چندر کی وقعت ایک غدار سے زیادہ نہ تھی جس نے ملک و ملت کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ سنجوگتا

کو بھلا کب گوارا تھا کہ اُس کا شوہر اپنا فرض ادا کرنے
میں کوتاہی کرے۔ اُس نے راٹھور بہادر کو جو ابھی میٹھی نیند
کے مزے لے رہا تھا چونکایا۔ خود اپنے ہاتھوں سے اُسکے
ہتھیار باندھے۔ تلوار کمر سے لگائی اور رخصت کر کے
کہا۔ "میرے مالک! میرے غیرت دار سرتاج! اگر تم کامیاب
لوٹے تو ہندوستان ہمیشہ کے لئے بچ جائیگا۔ اور دھرم کی
لاج رہ جائے گی۔ تمھاری نیک نامی ہو گی۔ وطن کی
حفاظت کا سہرا تمھارے سر رہے گا۔ اور اگر تم لڑائی میں
کام آگئے تو ایک بہادر راجپوت کی موت تم کو نصیب
ہو گی۔ ملک و ملت کے لئے تمھاری قربانی قابل یادگار
ہو گی۔ ہم تم سورگ میں پھر ملیں گے۔ جہاں ہم کو دائمی
مسرت نصیب ہو گی۔ تمھارا نام ملک کے لئے جان دینے
والوں کی فہرست میں سب کے اوپر ہو گا۔ تم جاں نثاری

اور وفا کی ایک مثال قائم کر جاؤ گے۔ جاؤ اور ملک پر سے
قربان ہو جاؤ۔"

تھانیسر کی دوسری لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ پرتھوی
راج کا بھیجہ تھا جو آخر وقت تک اس گھمسان لڑائی میں
قدم جمائے رہا۔ مگر آخرکار زخموں سے چور ہو کر گھوڑے
سے نیچے آ رہا۔ اور ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہا۔
جس وقت سنجوگتا کو یہ خبر پہونچی اُس کو کوئی ہراس
نہ ہوا۔ لبوں پر وہی اگلی سی مسکراہٹ تھی اور چہرے
سے وہی اطمینان نمایاں تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں
کو حکم دیا "چتا تیار کرو۔" آگ جب خوب بھڑک گئی تو ہنستے
ہوئے سنجوگتا نے اپنے پھول سے نازک جسم کو اُسکے حوالہ کر دیا
اور اپنے بہادر سرتاج سے سورگ میں جا ملی۔
"قربان ہونے والے کے قربان جائیے"

(۶)

پدمنی

تیرہویں صدی کا آخری دور تھا۔ ملک میواڑ ایک نوجوان کم سن شاہزادہ لکشمن سنگھ کے زیر حکومت تھا۔ میواڑ راجپوتانہ میں واقع ہے۔ اس کو لوگ بہادروں اور نام آوروں کا دیس کہتے ہیں۔ شاہزادہ بہت کم سن تھا سلطنت کا کاروبار سنبھالنا اُس کے لئے سہل کام نہ تھا اس لئے اُس کے چچا نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ شہزادہ کا نام بھیم سنگھ تھا میواڑ کی راجدھانی چتوڑ تھی۔ اب تک اُس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور اُجڑی ہوئی عمارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ بہت بڑا شہر رہا ہوگا۔ بھیم سنگھ نے ایک حسین لڑکی سے شادی کی تھی۔ نام اُس کا پدمنی تھا۔ وہ لنکا کے چوہان راجہ امر سنگھ

کی بیٹی تھی - پدمنی اُس کا نام کیوں پڑا؟ کہتے ہیں وہ بڑی
خوبصورت تھی - اور ایک کھلے ہوئے کنول سے مشابہ
تھی - اُس کا نام خود ہی اُس کے حسن کی دلیل ہے - اُسکی
صورت دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے - شاعروں کا بیان
ہے کہ پدمنی کے حُسن صورت اور حُسن سیرت کی پوری
تعریف کرنا محال ہے - اُسکی آنکھیں ستاروں کو ماند کردیتی
تھیں - اُس کا بدن گلاب سے زیادہ نازک اور ملائم
تھا - اُس کے دانت موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور
آبدار تھے - اور اُس کے رنگیں ہونٹ یاقوت کو مات کرتے
تھے - اُس کی سُبک خرامی لوگوں کے دلوں کو پائمال
کردیتی تھی جب وہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بط
پانی کی سطح پر تیر رہی ہے - ان خوبیوں کے علاوہ اُس کے
دل میں رحم اور خدا ترسی بھی بے انتہا تھی - وہ سخی بھی اُسی قدر

تھی جس قدر وہ حسین تھی۔

جس زمانہ میں پدمنی کے حسن و جمال کا چرچا بچہ بچہ کی زبان پر تھا، دہلی میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نام اُس کا سُلطان علاءالدین خلجی تھا۔ پدمنی کی خوبصورتی کا شہرہ اُس کے کانوں تک بھی پہنچا۔ درباریوں نے کچھ ایسا شوق دلایا کہ سلطان کے دل میں غائبانہ محبت کا بیج پڑ گیا۔ اور پھر پدمنی کی دُھن ایسی سوار ہوئی کہ اُس نے طے کر لیا کہ پدمنی میرے حرم میں آکر رہے گی اُس کا دھیان سُلطان کو ہر وقت بے قرار رکھنے لگا۔ اُس کی خیالی تصویر سُلطان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ دن کا چین رخصت ہو گیا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ محل میں تو، شکار میں تو، یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی بس ایک خیال تھا اور ایک دُھن۔ وہی ایک آرزو

اور رہی ایک فکر۔ کس طرح اُس دُرِ بے بہا کو چتوڑ سے اُڑا
لاؤں؟ کیونکر اُس کنول کے پھول کو وہاں سے توڑ لاؤں؟
کیونکر اُسکی پرستش کروں اور اُس کو اپنے گلے کا ہار بناؤں
آخری تدبیر جس پر وہ اب عمل کرنے والا تھا یہ تھی کہ چتوڑ کا محاصرہ
کیا جائے۔ اور اِس طرح قلعہ فتح کرکے پدمنی کو حاصل کیا جائے
اسکے سوا چارہ کا رہی کیا تھا؟ اِدھر سُلطان نے فیصلہ
سُنایا اُدھر کوچ کا سامان شروع ہوا۔ چتوڑ کا محاصرہ تو آناً فاناً
ہو گیا مگر لڑائی نے طول کھینچا۔ چتوڑ پر قبضہ کر لینا بچوں کا
کھیل نہ تھا۔ بہادر راجپوت ہتھیلی پر سر لئے لڑ رہے تھے
اُنھوں نے قسم کھالی تھی کہ ہم آخر وقت تک سر نہ جھکائیں گے
اُن کو عزت زندگی سے کہیں عزیز تھی اُن کے لئے جان پر
کھیل جانا آسان تھا۔ مگر اپنی ملکہ پدمنی کو دشمن کے حوالے
کرنا ناممکن تھا۔ پدمنی سارے چتوڑ کی آبرو تھی۔ اِسکی حفاظت

اُن کا دین و ایمان تھا۔

آخر کار سلطان کو یقین ہو گیا کہ میری سعی رائگاں ہو گئی اور میری ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اب بجز حکمت عملی سے کام لینے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اُس نے راجہ کو یہ پیغام بھیجا کہ تم صرف اتنی اجازت دے دو کہ اُس حُسن کی دیوی کو ایک نظر دیکھ لوں۔ راجپوت شریف زادیوں میں بھی پردہ کی رسم تھی۔ کوئی اُنھیں بے حجاب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ راجہ نے جواب میں کہلایا کہ پدمنی سامنے تو نہ آئے گی ہاں آئینہ کے مقابل رُخ کر کے کھڑی ہو جائیگی سُلطان محض عکس کی زیارت کرلے۔ کشتۂ محبت سلطان نے اسی کو غنیمت جانا۔ فوراً حامی بھر لی۔ بھیم سنگھ نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اُسکی سخاوت تھی جس نے سلطان کے سوال کو رد نہ ہونے دیا۔ بادی النظر میں تو یہی کہا جائیگا

کہ بھیم سنگھ کی مجبوریاں تھیں جو اس سے سب کچھ
کرا رہی تھیں۔ علاء الدین چند ہمراہیوں کے ساتھ قلعہ
میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تک آئینہ میں پدمنی کے رُخ
بے نقاب سے دِل بہلاتا رہا۔ پھر قلعہ سے باہر آنے کا
قصد کیا۔ راجہ کی اس خاطر اور ہمدردی کا دل کھول کر
شکریہ ادا کیا۔ دستور اور رواج کے مطابق راجہ سلطان
کو چند قدم پہونچانے کے لئے قلعہ سے باہر آگیا۔ اسکو خواب
میں بھی اس کا گمان نہ ہوا تھا کہ تشکر کے الفاظ میں دغا
اپنا کام کر رہی ہے۔ سُلطان راجہ کی نوازشوں کے گیت
گاتا جا رہا تھا۔ اور راجہ اپنے دل میں مسرور ہو رہا تھا۔
یکایک سُلطان نے رُخ بدلا۔ ابرو کے ایک اشارے
میں کچھ آدمی دوڑے اور راجہ کو حراست میں لے لیا۔ وہ
آدمی پہلے سے اس کام پر تعینات کر دیے گئے تھے۔

راجہ نے بھی تلوار کھینچ لی ۔ چاہتا تھا کہ سلطان
کو بہادری کے جوہر دکھائے ۔ مگر اکیلا دم کہاں تک لڑتا ۔
آخر مغلوب ہو گیا ۔ پٹھان اُس کو قید کر کے دہلی لے گئے
بھیم سنگھ کی مہمان نوازیوں کا سُلطان کی طرف
سے یہ بدلہ دیا گیا ۔ احسان فراموشی ہے تو بدترین گناہ
مگر افسوس عشق نے سلطان کی عقل پہ پردہ ڈال رکھا
تھا ۔ پدمنی کی محبت میں وہ اندھا ہو رہا تھا ۔ اُسے نیک
و بد کی کوئی تمیز نہ رہی ۔ اور کلنک کا ٹیکا اُسکی پیشانی
پر لگ کر رہا ۔

جب یہ وحشت خیز خبر پھیلی تو چیتوڑ کے لوگ تلملا
گئے ۔ اور پدمنی کے صدمہ کی تو کوئی انتہا نہ رہی
دُنیا اُس کی نظروں میں تیرہ و تار ہو گئی ۔ سُلطان نے بھی
ایک پل ضایع نہ ہونے دیا ۔ پدمنی کو پیغام بھیجا ۔ "راجہ

کی خیر چاہو تو خود کو سلطان دہلی کے حوالہ کر دو۔"

پدمنی بھی راجپوت تھی غیرت جوش میں آ ئی مگر کر ہی کیا سکتی تھی؟ اس گستاخانہ پیغام پر چیں بہ جبیں ہو کر رہ گئی۔ مگر وہ جتنی حسین تھی اُتنی ہی ذکی و ذہین بھی تھی۔ غور کرنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح سُلطان کو زک دینا چاہیئے۔ اُس نے اپنے چچا گورا اور اُس کے بھتیجے بدل کو طلب کیا۔ ردّ و کد کے بعد یہ بات طے پا گئی کہ راجہ کی رہائی بھی ممکن ہے اور اس میں پدمنی کی زندگی اور اُسکی عصمت و عفّت بھی محفوظ رہے گی۔

جب تمام کارروائیاں مکمل ہو گئیں تو اُس نے سُلطان کو جواب میں کہلا بھیجا کہ "میں سلطان کے محل میں آنے کو تیار ہوں۔ شرط اتنی ہو گی کہ دہلی تک میرا ڈولہ اُسی شان کے ساتھ جائے جو ایک شاہزادی کے لئے

موزوں ہو۔ اُسکی لونڈیاں باندیاں اور اُس کے اپنے ہی آدمی ساتھ ہوں گے۔" اس نے یہ شرط بھی پیش کی کہ "کوئی متنفس اُس کے پاس تخلیہ میں آنے کی جرأت نہ کرے۔"

جب یہ خوش خبری سلطان کو ملی وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ وہ اپنے کو بے حد خوش قسمت تصوّر کرنے لگا کہ پدمنی اس آسانی سے اُس کے دام میں آ گئی۔ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ پدمنی کو حاصل کر لینا آسان نہیں ہے۔ ابھی اُسے نہ جانے کیا کیا زحمتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ اُس نے جھٹ پدمنی کے پاس کہلا بھیجا کہ "بسر و چشم تمہاری شرائط کو منظور کرتا ہوں۔ تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ اور جس شان و شوکت سے چاہو دہلی چلو۔ پدمنی نے ادھر

مطمئن ہوکر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سات سو ڈولے حاضر
کریں جس پر نہایت بیش قیمت اور خوب صورت پردے پڑے
ہوں۔ جب ڈولے آ گئے تو ہر ڈولے میں چتوڑ کے ایک نامور
بہادر کو اُس میں بٹھایا۔ اور ہر ڈولے کو چھ مسلح سپاہی کہار
کے بھیس میں دہلی کو لے چلے۔ خود محل میں بیٹھی اپنی انوکھی تدبیر
کی کامیابی کا انتظار کرنے لگی۔

جب سُلطان نے ڈولوں کے اتنے بڑے جلوس کو آتے
دیکھا تو پھولا نہ سمایا۔ دل مارے خوشی کے بانسوں اُچھلنے لگا۔
وہ اب اس کا منتظر تھا کہ پدمنی کب میرے خیمہ کو اپنے قدموں
فردوس بناتی ہے۔ پالکیاں کیمپ تک آئیں اور ٹھہریں۔
اب ایک آخری تمنا تھی جو پدمنی کی طرف سے سلطان کی خدمت
میں پیش ہوئی وہ یہ تھی کہ اب میں اپنے پہلے شوہر بھیم سنگھ
سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا چاہتی ہوں اُسے آخری بار

ایک بار صرف ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت دے دی جائے
سلطان کو کسی قسم کے دھوکے اور فریب کا گمان بھی نہ تھا
اُس نے یہ درخواست منظور کی۔ بھیم سنگھ کو نصف گھنٹہ تک
پدمنی سے گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا۔ راجہ ایک پالکی میں
داخل ہوا جو سب کی آنکھوں میں خاک جھونک کے دہلی سے
چتوڑ رخصت کر دی گئی۔ بقیہ جیوں کی تیوں ٹھہری رہیں۔
سلطان کو اب انتظار کی تاب نہ رہی نصف گھنٹہ سے زیادہ
ہو چکے تھے۔ اب اُسے کچھ شبہ پیدا ہوا کہ غالباً یہ کوئی نئی چال
ہے۔ پدمنی کی پالکی کی طرف لپکا مگر وہاں کیا تھا، ایک مسلح
بہادر راجپوت۔ تعاقب ہوا مگر بے سود۔ راجپوت ایک ایک
کر کے خون میں لوٹنے لگے مگر اتنا موقع نہ دیا کہ سلطان کے
سپاہی راجہ کو پھر گرفتار کریں۔

راجہ ایک برق دم گھوڑے پر اڑتے پھرتا چتوڑ کی

طرف اُڑا جا رہا تھا سلطان کے آدمی بھی پیچھا کرنے کے لئے دوڑے۔ اور راجہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھے کہ راجہ اپنے قلعہ کی پناہ میں آگیا۔ نا اُمید و ناکام سلطان کو آن کر خبر دی۔ سلطان غصّہ میں آگ بگولا ہوگیا اور ایک مرتبہ پھر چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر گھمسان مگر مختصر جنگ ہوئی گورا پدمنی کا چچا جوہر مردانگی دکھاتا ہوا قتل ہوا۔ دونو طرف بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ گورا کی بی بی نے شوہر کے قتل کا حال سُنا تو بے حد خوش ہوئی۔ وہ بدل کی زبانی یہ سُن کر بے حد مسرور ہوئی کہ گورا بہتیروں کو تلوار کے گھاٹ اُتار کر قتل ہوا۔ اور پھر دستور کے مطابق مع چند عورتوں کے اپنے جسم کو آگ کی نذر کیا۔ آگ میں کودتے کودتے بھی اُس کی زبان سے یہی نکلا "میرا شوہر میرا منتظر ہوگا"۔ علاء الدین اپنی بقیہ شکست خوردہ

فوج کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

سالہاسال گزرتے گئے۔ مگر سلطان کی محبت کی آگ اسی طرح بھڑکتی رہی۔ وہی چاند سا مکھڑا دن رات اس کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔ اسے کسی جگہ کسی گھڑی قرار نہ تھا۔ آخر کار اس نے چتوڑ کے محاصرہ کی پھر تیاری کر دی ابھی راجپوت پچھلے نقصانات کی تلافی نہ کر سکے تھے کہ پھر وہی مصیبت سر پر آ گئی جس آفت سے نجات ملی تھی اسی میں پھر مبتلا ہو گئے۔ باوجود جان توڑ کوشش کے راجپوت اس مرتبہ تاب مقاومت نہ لا سکے۔ راجہ نے بہتیری تدبیریں کیں مگر سب بے سود ثابت ہوئیں۔ راجپوت بہادر ایک ایک کر کے تلوار کی نذر ہوتے گئے۔ خود راجہ کے گیارہ لڑکے اس مشہور جنگ میں کام آئے۔ صرف ایک لڑکا بچ رہا تھا۔ مجبور ہو کر راجہ نے زرد لباس زیب تن کیا۔ یہ نشانی تھی فتح کی

یا موت کی۔ راجہ رَن میں آ گیا اور داد مردانگی دیتا ہوا
دُنیا سے رخصت ہوا۔

پدمنی فصیل پر کھڑی جنگ کا سماں دیکھ رہی تھی
جب اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نہ راجپوت رہ گئے اور
نہ راجہ تو اپنی سہیلیوں سے کہا۔ "اب جینا بے کار ہے۔
بے عزتی کی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے۔ آؤ! ہم لوگ بھی چتوڑ
کی تاریخ میں اپنا نام کر جائیں جب سلطان ہمارے آدمیوں کو
قتل کر کے چتوڑ کے قلعہ میں داخل ہو تو سوائے آگ کے شعلوں
اور خاک کی ڈھیر کے اُسے کچھ ہاتھ نہ آئے۔" یہ مختصر سی تقریر
تھی جس نے ساری عورتوں کے خون میں حرکت پیدا کر دی
چتا تیار ہوئی اور عورتوں کا جلوس آگ میں کودنے کے
لئے آگے بڑھا۔ پدمنی نے دوبارہ عورتوں کو مخاطب کیا اُٹھ
کہا۔ تم میں سے جس کو عزت سے جان پیاری ہو وہ میرے سا

ساتھ نہ آئے پیچھے ٹھہری رہ جائے۔" مگر کون عورت تھی جو پدمنی کے ہم خیال نہ تھی۔ سب نے پدمنی کا ساتھ دیا۔ پھول سے نازک جسم شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح "جوہر" کی رسم ان راجپوت عورتوں نے ادا کی۔

سلطان فتح کے شادیانے بجاتا قلعہ میں بہ حیثیت فاتح کے داخل ہوا۔ اُس وقت سُلطان کی اُمنگیں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ آج ایک مدت کی حسرت نکلے گی۔ پدمنی سے دل کھول کر ملوں گا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ پدمنی اس طرح بچ نکلے گی۔

جب وہ آگ کے شعلے سے دوچار ہوا تو اُسے جلنے والیوں کے حال پر ترس آ گیا۔ تھا تو بے حد سخت دل مگر اس دردناک منظر کی وہ بھی تاب نہ لا سکا۔ اُس نے

اپنے آدمیوں کو روک دیا اور حکم دیا کہ پدمنی کا خوبصورت محل یوں ہی رہنے دیا جائے۔ اُسے مسمار نہ کیا جائے چنانچہ وہ محل اب تک جھیل کے کنارے جان باز رانی کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔

(۷)

اہلیہ بائی

اب تک تمام کہانیوں میں اُن بہادر اور جری عورتوں کی یاد تازہ کی گئی ہے جن کے کارنامے تاریخ کے صفحوں پر سنہرے حرفوں میں اس طرح منقوش ہیں کہ زمانہ انکو کبھی مٹا نہیں سکتا۔ ان عورتوں نے اپنے اور اپنے ملک کے بدخواہوں کے مقابلہ میں اپنی خداداد جرأت اور دلیری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ آخری کہانی بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ یہ ایک پاکباز اور پاک طینت رانی کا قصہ ہے جس کا نام "اہلیہ بائی" ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس رانی نے کوئی جنگی مہم نہیں سر کی۔ مگر جس امن و صلح اور سلیقہ کے ساتھ "اہلیہ بائی" نے اپنی سلطنت کی دیکھ بھال کی، وہ تاریخ میں قیامت تک یادگار رہے گا۔ اسکی شہرت اسکے حسن انتظام ہی کے باعث ہوئی۔ مغرب کے مشہور شاعر

ملٹن کا قول ہے کہ "امن و امان کے ساتھ فتح کی شہرت جنگ کی فتوحات کی شہرت سے کچھ کم نہیں ہوتی"۔ اس سے اہلیہ بائی کی تاریخی شہرت ملٹن کے خیال کی تائید کرتی ہے۔

اہلیہ بائی ایک غریب مگر معزز گھرانے کا چشم و چراغ تھی۔ باپ کا نام آنندراو سیندھیا تھا۔ جو ایک معمولی کسان تھا۔ چند بیگھے کھیت پر اس کی اور اسکے اہل و عیال کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ ہاں اس کو یہ فخر ضرور حاصل تھا کہ وہ سندھیا کے مشہور شاہی خاندان سے نسبت رکھتا تھا۔ ایک زمانہ تک اس کو اولاد کی حسرت رہی اور پوری نہیں ہوئی۔ مگر ۱۷۳۵ء میں اسکی مراد بر آئی اور اسکے گھر کو خدا نے ایک بچی سے گلزار کر دیا۔

اس بچی کا اہلیہ دیوی کے نام پر اہلیہ بائی رکھا گیا اہلیہ دیوی گوتم رشی کی بیوی تھی۔ گوتم رشی ہندوستان

کے اُن سات مشہور رشیوں میں سے تھے جن کا نام بڑے
احترام اور تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

اہلیہ بائی میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو
ایک ہندو لڑکی کے شایاں ہیں طبیعت میں سادگی اور
دل میں رحم اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خیرات
اور غریب نوازی، عبادت اور بندگی کا سبق اُس نے
اُن قصوں اور کہانیوں سے حاصل کیا جو اُسکے ماں باپ
اُس کو سُنایا کرتے تھے۔ اسی ابتدائی تعلیم نے اُسکے دل
میں ہمدردی، خلوص، قوم پرستی اور حبِ وطن کے
بیج ڈالے۔

اس کی شادی کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ملہار
راؤ ہلکر ایک مرہٹہ سردار تھا۔ اتفاقاً اُس کا گزر اُس علاقہ
میں ہوا جہاں اہلیہ بائی رہتی تھی۔ اُسکی عمر نو سال سے

زیادہ نہ تھی۔ فوج کی آمد کا غل سُنا تو جیسا کہ بچوں کی عادت ہے
دیکھنے کے لئے دوڑی۔ مرہٹہ سردار پر اُسکی سادگی اور اُسکے
معصومانہ انداز نے جادو کا اثر کیا۔ اُسکا دل بے اختیار اہلیہ
بائی کی طرف کھنچا اور اُس نے شفقت پدری کے ساتھ اہلیہ
بائی کو گود میں اُٹھا لیا۔ بڑی دیر تک پیار کرتا رہا۔ دیہات والوں
سے دریافت کیا "لڑکی کس کی ہے؟" جب معلوم ہوا کہ "سندھیا
خاندان" کے معزز گھرانے کی بیٹی ہے تو اُس نے انندراؤ کو طلب
کیا اور اُس سے کہا "میں اہلیہ بائی کو اپنے لڑکے کی دُلھن
بنانا چاہتا ہوں کیا تمھیں بھی یہ رشتہ منظور ہے؟" غریب کسان کی
خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ملھار راؤ کی زبان سے رشتہ کی آرزو
اُسکو خواب و خیال کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو اُسکی
سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سُن رہا ہے۔ مگر جب "ہلکر" نے اپنی آرزو کا
دوبارہ اظہار کیا تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اُسنے "ہلکر" کو

ہزاروں دعائیں دیں۔ اُسنے جو احسان آیاغےبیکسان پر کیا تھا اُسکا بدلہ ناممکن تھا۔ شادی کی خوشیاں اعلیٰ پیمانہ پر منائی گئیں اور تمام پوربی رسمیں ادا کی گئیں۔ وہ "اہلیہ بائی" دولھن بنکر اپنے شوہر کے گھر آئی۔

اپنی سعادتمندی اور خوش سلیقگی کی بدولت اہلیہ بائی سسرال میں سب کو عزیز تھی۔ اُس نے ساس سسر اور شوہر سب کا دل موہ لیا "ہلکر" بڑا تنک مزاج تھا۔ بہت جلد جامہ سے باہر ہوجاتا تھا۔ ذرا سی غلطی معمولی سی خطا اُسکے مزاج کو برہم کردیتی تھی۔ مگر "اہلیہ بائی" کی شیریں کلامی اور نرمی "ہلکر" کے غصہ کو بہت جلد ٹھنڈا کر دیتی تھی اُسکی محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ "اہلیہ بائی" نہ صرف خانہ داری کے انتظام کی نگرانی کرتی تھی بلکہ دوسروں کا ہاتھ بھی بٹالیتی تھی قاعدہ ہے کہ فلاکت کی سختیاں جھیلنے کے بعد عیش و عشرت کا زمانہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔ "اہلیہ بائی" اس عیب سے پاک تھی۔

جاہ و ثروت پانے کے بعد بھی اُس میں وہی سادگی۔ وہی معصومیت اور وہی ہمدردی تھی۔ وہ معمولی گھرانوں کی عورتوں کی طرح اپنے ہاتھ سے گھر کا کام دھندا کرتی تھی اور بیجا نزاکت و نفاست کو کبھی راہ نہیں دیتی تھی۔

شادی کے نو سال بعد اہلیہ بائی کی قسمت نے پلٹا کھایا اہلیہ بائی کا پیارا شوہر ایک جنگ میں کام آگیا۔ اور اُسے رنڈاپے کی کٹھن گھڑیاں کاٹنے کے لئے چھوڑ گیا۔ زمانہ کی رسم کے مطابق اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ شوہر کے ساتھ ستی ہو جائے مگر بوڑھے اور ضعیف ملہار نے آبدیدہ ہو کر کہا "بیٹی! ایک ہی پُتر تھا جو داغ دے گیا۔ بقیہ زندگی کا سہارا لے دے کر تو ہی جو ساتھ چھوڑنے پر تُلی ہے۔ اگر ایسا کیا تو اس بڈھے کا خدا حافظ ہے۔ میری سُن! بڈھے کی بے کسی پر ترس کھا اور اپنے ارادہ سے باز آجا!" بوڑھے ملہار کی پر درد التجا سے اہلیہ بائی

کا عزم و استقلال کمزور پڑ گیا۔ اُس نے سوچا کہ مُردہ سے زیادہ زندہ قابل توجہ ہے۔ بُڈھے سسر کا دل توڑنا اچھی بات نہیں۔"

اُس گھڑی سے اہلیہ بائی نے ہلکر کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ امور سلطنت میں اہلیہ بائی "ہلکر کا زبردست ہاتھ ثابت ہوئی۔ ۱۷۶۱ء میں جب ہلکر "پانی پت کی جنگ میں شریک ہونے گیا تو سلطنت کا کام اہلیہ بائی کے سپرد کر گیا۔ جب واپس آیا تو اہلیہ بائی کے انتظام سے بیحد خوش ہوا۔ کہیں کسی قسم کی خرابی نہیں پائی گئی۔ اُس نے اہلیہ بائی کو بڑی شاباشی دی اور اُس کا دل بڑھایا۔

۱۷۶۹ء میں ہلکر دُنیا سے رخصت ہوا۔ اہلیہ بائی کا کمسن بچہ راج پاٹ کا مالک ہوا۔ مگر وہ بیوقوف اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوا۔ رعایا سختی سے عاجز تھی اور درباری اُسکی

بدسلوکیوں سے بدظن تھے۔ ریاست کی خوش قسمتی تھی کہ موت نے اُس کم سن اور ناقص العقل راجہ کا خاتمہ کر دیا۔

اب "اہلیہ بائی" نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی پیشوا نے بھی سند عطا کر دی۔ چونکہ کوئی مرد نہ تھا۔ گدی کی مالک مختار وہی قرار پا گئی۔ رگھوناتھ راؤ پیشوا کا چچا تھا حسد کی آگ اُسکے دل میں بھڑک اُٹھی اُس نے مخالفت کی اور چڑھائی بھی کی۔ مگر رعایا اہلیہ بائی کو "دیوی" سمجھتی تھی۔ تلوار تول کر مقابلہ پر آگئے اور رگھوناتھ راؤ کے دانت کھٹے کر دئے۔ اُس نے امن و امان کیساتھ پورے تیس سال حکومت کی۔ ایک انگریز مورخ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اہلیہ بائی کی حکومت واقعی حیرت انگیز تھی"۔ اندور ایک معمولی قصبہ تھا۔ اہلیہ بائی نے اُسے ترقی دیکر ایک شہر بنا دیا۔ اُسکی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ملک خوشحال ہو جائے۔ خود تکلیفیں اور زحمتیں برداشت کیں مگر مالوہ میں امن قائم کر دیا۔ نہ صرف اُسکی

رعایا اسکی ہمدردی اور رحم سے مستفید ہوتی تھی بلکہ جنگل کے جانور، ہوا میں اڑنیوالی چڑیاں، دریا کی مچھلیاں سبھی اسکی داد دہش اور فیض رسانی سے پورا فائدہ اٹھاتی تھیں۔

ہندؤں میں خیرات ہی تمام نیکیوں کی اصل بتائی گئی ہے اہلیہ بائی کو "ستی بوہی" تصور کرتے تھے۔ وہ مجسم سخاوت تھی۔ اس پاک باطن عورت نے تمام ہندوستان میں مندر اور دھرم شالے بنوائے گیا میں "وشنوجی" اور بنارس میں "شیشر" کا مندر اسکی یادگار ہیں ان تمام مذہبی امور میں بے حساب دولت صرف ہوئی مگر ملھار رائے کا خزانہ خالی ہونے والا نہ تھا۔ خزانہ سے غربا کو کھانا اور کپڑا دیا جاتا تھا۔ محتاج ساری سلطنت میں ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔ "وندھیا" کی پہاڑی وادیوں و دشوار گزار راستوں سے ایک سڑک نکالی جس سے آمد و رفت آسان ہوگئی۔ عوام کی خیر اندیشی نے رعایا کو اہلیہ بائی کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کے

خلاف بغاوت کا خیال لوگ گناہ سمجھنے لگے تھے۔ کوئی
اُس کی حکومت سے نالاں نہ تھا۔ وہ اپنے کو اپنی رعایا
کی خدمتگزار سمجھتی تھی۔ تصنع اور تکلف کو پاس پھٹکنے نہیں
دیتی تھی۔ اُس کا ہر قدم رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے اُٹھتا
صبح شام رعایا اور سلطنت کی بہبود ہی کی فکر دامنگیر رہتی
تھی۔ مشرق یا مغرب کے سلاطین میں اس کی نظیر ملنا بہت
دُشوار ہے۔ پاک باطنی اور سادگی میں وہ سلطان "ناصر الدین"
کی ہمسر تھی۔ مذہبی آزادی میں "اکبر" کی، اور رحم اور سخاوت
میں "اشوک" کی ہم قدم تھی۔

سر جان مالکم نے متعدد واقعات اُسکی ہمدردی
کے بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رعایا کی بھلائی کا اُسے
بے حد خیال تھا۔ انصاف کا خون کبھی روا نہ رکھتی تھی
مقدمات کا فیصلہ کرنے میں جانبداری کو راہ نہ دیتی تھی۔

ایک امیر ساہوکار قضا کر گیا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جائداد ریاست نے ضبط کر لی۔ ساہوکار کی بیوی نے اہلیہ بائی کی خدمت میں عرضی بھیجی۔ اہلیہ بائی نے ساری ملکیت ساہوکار کی بیوہ کو واپس کر دی۔ اپنے ملازموں اور کارکنوں کو رعایا پر ناجائز سختی کرنے سے روکتی رہتی تھی۔ اس طرح کے سیکڑوں سلوک تھے جنکی بدولت اب تک اُس کا نام زندہ ہے۔ اور لوگ اُس کی پرستش کرتے ہیں۔

اُس کی روزانہ زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بہت پرہیز گار، منصف مزاج، اور سادہ لوح تھی۔ علی الصباح اُٹھتی، نہاتی، عبادت کرتی پھر فقیروں اور غریبوں کو شکم سیر کھانا کھلاتی اور خیرات تقسیم کرتی۔

خود اُس کی غذا بالکل سادہ تھی۔ گوشت تو چھوتی نہ تھی۔ دو بجے دربار لگتا تھا۔ اہلیہ بائی صبر اور استقلال کے ساتھ مقدمات کو سنتی اور نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ فیصلے سُناتی۔ دربار چار بجے تک لگا رہتا۔ کوئی کام کل پر نہ چھوڑا جاتا۔ چھ بجے عبادت خانہ میں چلی جاتی وہاں سے فراغت پاکر کھانا کھاتی جو بالکل سادہ ہوتا۔ اسکے بعد وزراء کے مشورہ سے خفیہ معاملات کو طے کرتی۔ یہ تھے اہلیہ بائی کے عادات حسنہ اور یہ تھے اُسکے اخلاق حمیدہ۔

دربار میں ہوتی یا گھر میں کسی کے ساتھ ترش روئی سے پیش نہ آتی۔ ہاں جب کسی بدمعاش کو سزا دینا مقصود ہوتا تو البتہ غصہ کا اظہار کرتی۔ اُس کے بعد پھر غصہ کی کوئی علامت باقی نہ رہتی۔ وہی متانت وہی سنجیدگی پھر چہرہ سے ٹپکنے لگتی۔

خوشامد سے اہلیہ بائی کو نفرت تھی۔ سر مالکم کہتا ہے

"اہلیہ بائی اُن عورتوں میں سے تھی جن میں غرور اور خود نمائی کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ اس کے حسن سیرت کا پورا مُرقع پیش کرنا دُشوار ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کی نظیر دُنیا کے پرہیزگار اور ضرب المثل حکمرانوں میں مشکل سے ملے گی۔"